عورت اور اسلام

ایک سیمینار کا جائزہ
اور تحقیقی رپورٹ

از

مولانا محمد شہاب الدین ندوی

مجلس نشریات اسلام
۱۔کے۔۳۔ناظم آباد مینشن۔ناظم آباد۔کراچی ۱۸

عورت اور اسلام

ایک سیمینار کا جائزہ
اور تحقیقی رپورٹ

از:

مولانا محمد شہاب الدین ندوی

مجلس نشریاتِ اسلام

۱۔کے۔۳۰ ناظم آباد مینشن، ناظم آباد ۱، کراچی ۷۴۶۰۰

انتساب

مُسلمان عورت کے نام جس کی مظلومیت
کا رونا روتے ہُوئے موجودہ دور میں حق کو ناحق اور
ناحق کو حق ثابت کرنے کی منظّم کوشش کی جارہی
ہے۔

فہرستِ مضامین

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

احوالِ واقعی

راقم سطور کا اصل موضوع قرآن اور سائنس یا قرآن اور کلامیاتِ جدیدہ رہا ہے اور اسی اعتبار سے میری تصنیفی زندگی کا آغاز بھی ہوا ہے۔ مگر ۱۹۸۳ء میں اور اس کے بعد اچانک ایک تغیر آیا اور میرے موضوعات میں وسعت پیدا ہوگئی۔ ہوا یہ کہ مجھے دہلی کے ایک سیمنار میں شرکت اور "عورت اور انتظامیہ" کے موضوع پر ایک مقالہ پیش کرنے کی دعوت دی گئی۔ اس طرح پہلی بار مجھے ایک شرعی مسئلے پر نہ صرف ایک تحقیقی مقالہ پیش کرنے کا موقع ملا بلکہ کچھ روشن خیال اہلِ علم سے بھی براہِ راست ملنے اور ان کے خیالات و رجحانات کو سمجھنے کا بھی ایک اچھا خاصا موقع ملا۔ پھر اس کے بعد ملک میں کچھ ایسی تحریکیں چلیں جن کے پیشِ نظر اسلامی قانون و شریعت کو بھی اپنے موضوعات میں شامل کرنا پڑا۔ اس طرح بندہ اب کلامیات اور شرعی مسائل و موضوعات دونوں پر کام کر رہا ہے۔ اور یہ میری ہابی ہے کہ جب میں کسی وادی میں ایک مرتبہ قدم رکھ دیتا ہوں تو پھر اُسے طے کئے بغیر چین نہیں آتا، خواہ وہ کتنی ہی خار دار اور پُر خطر کیوں نہ ہو۔ اور جس کام میں طبیعت لگ جاتی ہے اُسے ادھورا چھوڑنا کسی حال میں گوارا نہیں ہوتا۔ بلکہ طبیعت میں ایک طرح کی بے چینی اور ایک اضطراب سا رہتا ہے، جو اس کی تکمیل کی طرف لے جاتا ہے۔ اس طرح بندے نے اپنی زندگی میں کئی معرکے سر کئے ہیں۔ اور یہ بات بطور تحدیثِ نعمت عرض کی جا رہی ہے۔

غرض اس سیمنار میں جو عورت اور اسلام کے موضوع پر تھا، بعض تجدد پسند اصحاب سے بھی سابقہ پڑا، جنہوں نے اسلام میں عورت کے درجے کے بارے میں نہ صرف بعض غلط دعوے کئے تھے بلکہ اسلامی قانون کی بھی غلط تشریح و توجیہہ کرتے ہوئے اجتہاد کے ذریعہ اس میں بعض تبدیلیاں

کرنے کی بھی وکالت کی تھی۔ نیز عورت کی تمدنی حیثیت، عورت اور مرد کے درمیان مساوات، عورت کی تعلیم، پردہ، طلاق اور تعددِ ازدواج وغیرہ مسائل کے بارے میں اسلام کے صحیح نقطۂ نظر پر نکتہ چینیاں کرتے ہوئے مُسلمانوں کے موجودہ عمل کو دقیانوسی بتایا گیا تھا اور مسلمان عورت کو موجودہ "ترقی یافتہ" دور میں مرد کے شانہ بشانہ کام کرتے ہوئے ایک "خوشحال" زندگی بسر کرنے کی دعوت دی گئی تھی، تاکہ مسلمان عورت کو اُس کا "صحیح مقام" و مرتبہ پھر سے مل سکے، جس کو "ظالم مسلمانوں" نے زبردستی غصب کر رکھا ہے۔ چنانچہ وہ ایک طرف اپنی عورتوں کو "کال کوٹھریوں" میں قیدیوں اور اپاہجوں کی طرح بند کر کے رکھتے ہیں۔ دوسری طرف چار چار شادیاں کر کے عورتوں کا ناک میں دم کر دیتے ہیں۔ اور تیسری طرف انہیں طلاق دے کر ان کے حقوق غصب کرتے ہیں۔ چنانچہ بعض مقالہ نگاروں نے قرآن کے "حوالوں" سے عورتوں کی کامل مساوات کا دعویٰ کیا اور بعضوں نے اپنا سارا نزلہ تعددِ ازدواج (کثیر زوجگی) اور مرد کے حقِ طلاق پر اُتارا۔ گویا کہ یہ دونوں چیزیں اسلامی قانون میں "حقوقِ نسواں" کے اعتبار سے فتنے کی جڑ ہیں۔ اس لئے ان قوانین میں بذریعہ "اجتہاد" ترمیم کر کے ان کو بدل دینا چاہیے۔ اسی طرح کچھ لوگوں نے دعویٰ کیا کہ قرآن نے مردوں کو عورتوں پر برتری اور حاکمیت کا جو حق عطا کیا ہے (نساء: ۳۴) وہ اُس کا پیدائشی حق نہیں ہے، بلکہ خاندانی منصوبہ بندی نے اُسے یہ حق دلایا ہے۔ لہٰذا اگر حالات بدل جائیں تو ان سے یہ حق واپس بھی لیا جا سکتا ہے۔ اس طرح دو دنوں تک اس سیمینار میں "تحقیق" کے جام لنڈھائے جاتے رہے۔

اس مجلسِ مذاکرہ میں کچھ صاحبِ اہلِ علم بھی ضرور شریک تھے اور اسلامیات سے دلچسپی رکھنے والے بعض ہندو فضلاء بھی مقالہ نگاروں کی حیثیت سے موجود تھے۔ مگر یہ ایک حیرت انگیز بات دیکھنے میں آئی کہ مُسلم شرکاء کے برعکس ہندو شرکاء نے عورت اور اسلام کے موضوع پر اپنے مقالات میں کافی سنجیدگی اور متانت سے بحث کی اور حتی الامکان قابلِ اعتراض چیزیں پیش کرنے سے احتراز کیا۔

بہرحال اس سیمینار میں سب سے زیادہ قابلِ اعتراض مقالہ رامپور کے ایک صاحب کا تھا،

جن کے نام کے ساتھ "مولوی" کا لفظ بھی لگا ہُوا تھا۔ انہوں نے عورت کے بارے میں چند انتہائی بے سروپا دعوے کرتے ہُوئے ایک آیتِ قرآنی سے ایک عجیب وغریب استدلال کیا تھا۔ اور اس سلسلے میں علماء اور مفسّرین پر خواہ مخواہ کیچڑ اُچھالتے ہُوئے علمی دُنیا پر ڈاکہ ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ گویا کہ وہ ایک طرف اپنی "تحقیق" کے ذریعہ لوگوں کو مرعوب کرنا چاہتے تھے تو دوسری طرف مغالطوں کے ذریعہ عوام کو بہکانا چاہتے تھے۔ اس لئے راقم سطور کو غیرت آئی اور اُن کے غلط اور بے بنیاد دعووں اور ان کی افترا پردازیوں کا پردہ جب چاک کرنے بیٹھا تو اس کے نتیجے میں ایک اچھا خاصا علمی مضمون تیار ہوگیا جو اس کتاب کے آخر میں "عورت اور آزادانہ سیر و سیاحت" کے عنوان سے شامل کیا گیا ہے۔ اس سے قارئین کو پتہ چلے گا کہ موجودہ دور کے "گندم نما جو فروشوں" کی ذہنیت کا کیا حال ہے اور ان کے علم میں گہرائی کتنی ہوتی ہے!

اس سیمنار میں راقم سطور نے خود اپنا جو مقالہ پیش کیا تھا وہ کچھ ترمیم و اضافے کے ساتھ اب "عورت کی معاشی و تمدنی سرگرمیاں" کے عنوان سے شاملِ کتاب ہے۔ میرے یہ دونوں مقالات ماہنامہ الحق، اکوڑہ خٹک (پشاور۔ پاکستان) اور سہ ماہی سلسبیل بنگلور میں شائع ہوچکے ہیں، جن کو اہلِ علم حضرات نے بہت پسند کیا اور انہیں علیحدہ کتابی شکل میں شائع کرنے کی مانگ کی تاکہ ان کی افادیت عام ہوسکے۔

موجودہ دور میں تجدد پسندوں کا اصل نشانہ چونکہ تعددِ ازدواج (کثیر زوجگی) اور قانونِ طلاق ہیں، لہٰذا ان دو موضوعات پر بھی دو مختصر مضامین کتاب میں شامل کرنا مناسب سمجھا گیا تاکہ اس سیمنار پر ایک بھرپور تبصرہ ہوجائے۔ مگر طلاق کے موضوع پر جو مضمون شاملِ کتاب کیا گیا ہے وہ اگرچہ اصلاً سابق مرکزی وزیر عارف محمد خاں کے جواب میں لکھا گیا تھا۔ جن کا مطالبہ تھا کہ "طلاقِ بائن" اور "طلاقِ مغلظہ" کو ممنوع قرار دیا جائے۔ اور چونکہ اس سیمنار کا مطالبہ بھی اسی سے ملتا جلتا تھا اس لئے اس کو بھی اس مجموعہ میں شامل کرلیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ موجودہ دور میں اسلام کے مشروع کردہ قانونِ طلاق پر تجدد پسندوں کا جو اصل اعتراض ہے وہ ہر جلسے اور ہر سیمنار میں یہی ہے کہ اسلام نے اول تو مرد کو

براہِ راست طلاق کا حق دے کر گویا کہ عورت کے ساتھ ایک ناانصافی کی ہے اور دوسرے یہ کہ اُس نے تین طلاق کا حق دے کر ایک بہت بڑا ظلم کیا ہے۔ بلکہ وہ یہاں تک کہتے ہیں کہ تین طلاق کا قانون سرے سے اسلامی قانون ہی نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایجادِ بندہ ہے، جسے چند مولویوں نے گھڑ لیا ہے۔ اور وہ چند حدیثوں کی اُلٹی سیدھی تشریح کر کے یا من گھڑت انداز میں مسائل بیان کر کے عورت پر سخت ظلم کر رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ لہٰذا انصاف کا تقاضا ہے کہ مردوں سے اُن کا یہ حق چھین لیا جائے۔ یعنی قانون بنا کر تین طلاق وغیرہ کو ممنوع قرار دیا جائے۔

یہ ہے علماء کے سامنے موجودہ دور کا ایک نیا چیلنج۔ اب اس چیلنج کا مقابلہ کرنے اور اس غلط ذہنیت کا توڑ کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ علماء نئے انداز میں اسلامی احکام پر عقلی نقطۂ نظر سے کتابیں لکھیں اور اسلامی احکام کی خوبیوں اور ان کی حکمتوں کی وضاحت کریں، جس کے باعث اس قسم کے رکیک شبہات واعتراضات کا قلع قمع ہو سکے۔ لہٰذا راقم سطور نے ان موضوعات پر کام کرنا شروع کر دیا ہے۔ اور فی الحال مذکورۂ بالا دو مضامین اس میں شامل کر دئے گئے ہیں، تاکہ ان مسائل کی نوعیت سے قارئین آگاہ و باخبر ہو سکیں نیز طلاق اور تعددِ ازدواج کے سلسلے میں بعض صحیح حقائق اور اُن کی اصل غرض و غایت بھی لوگوں پر واضح ہو جائے۔ کیونکہ یہ مسائل ایسے ہیں کہ آج انہیں ہر جگہ اور ہر مقام پر موضوعِ بحث بنایا جا رہا ہے، گویا کہ دین و مذہب کا دارومدار انہیں دو مسائل پر ہے۔ لہٰذا پڑھے لکھے طبقے کو اب ان مسائل کا جاننا ضروری ہو گیا ہے تاکہ وہ ضرورت پڑنے پر مخالفوں کے شبہات کا جواب دے سکیں اور اُن کا مُنہ بند کر سکیں۔

غرض طلاق اور تعددِ ازدواج دو ایسے مسائل ہیں جن کو نشانہ بنا کر آج کل منظم طور پر کام کیا جا رہا ہے۔ کیونکہ وہ مجوّزہ یکساں مدنی قانون (یونیفارم سول کوڈ) کی راہ میں بھی بہت بڑی رکاوٹ بنے ہُوئے ہیں۔ لہٰذا حکومت انہیں ہر قیمت پر ــــ ترغیب و ترہیب دونوں طریقوں سے ــــ بدلنے پر تُلی ہُوئی ہے۔ اگرچہ ۱۹۸۶ء میں مُسلم خواتین ایکٹ کے بن جانے کے بعد یہ تحریک کچھ دبی دبی سی نظر آتی ہے، مگر یہ آتش کدہ پوری طرح سرد نہیں ہُوا ہے اور خاکستر میں ابھی چنگاریاں باقی ہیں جو وقت آنے پر

بھڑک کر شعلہ بن سکتی ہیں۔ لہٰذا عندلیبوں کو اپنے آشیانوں میں غافل نہ بیٹھنا چاہیئے۔

یہ صرف ایک سیمنار یا چند " روشن فکروں " کی بات نہیں بلکہ ایک عرصے سے یہ تحریک باقاعدگی کے ساتھ چل رہی ہے۔ اور اس قسم کے سیمنار تو اس تحریک کا محض ایک روپ ہیں۔ اور اخبارات کے ذریعہ بھی عوامی ذہن ہموار کرنے کی وقتاً فوقتاً کوشش کی جاتی ہے۔ اور خاص کر یہ تاثر دینے کی سعی ہوتی ہے کہ ہندستان میں جو اسلامی قانون یا مسلم پرسنل لا رائج ہے وہ اصل اسلامی قوانین سے ہٹا ہوا ہے۔ جبکہ بعض مسلم ممالک میں جو " اصلاح شدہ " قوانین نافذ ہیں وہ گویا کہ صحیح اسلامی قوانین کی نمائندگی کرنے والے ہیں۔ لہٰذا " ہندستانی اسلام " کو بدل کر " غیر ملکی اسلام " کو تسلیم کر لینا چاہیئے۔

چنانچہ بمبئی کے ایک مشہور وکیل .... نے انگریزی اخبار انڈین ایکسپریس مورخہ ۲۷ر و ۲۸ر دسمبر ۱۹۸۵ء کی دو اشاعتوں میں ایک مقالہ سپردِ قلم کیا تھا جس میں اسلامی قانون (مسلم پرسنل لا) میں اصلاح کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے تحریر کیا تھا کہ ہندستان میں رائج اسلامی قانون اصل اسلام سے ہٹا ہوا اور عورت کے لئے غیر منصفانہ بلکہ حد درجہ مہیب ہے۔ اور اس کے مقابلے میں بعض مسلم ممالک کا ترمیم شدہ قانون مطابقِ اسلام ہے۔ نیز انہوں نے تین طلاق اور تعددِ ازدواج پر پابندی عائد کرنے کا مطالبہ کرتے ہوئے فقہ حنفی پر اعتراض کیا ہے کہ اس نے " طلاقِ بدعت " کو جائز قرار دیا ہے۔ اور تحریر کیا ہے کہ تین طلاق ایک ایسا گناہ ہے جو (صرف) ہندستانی مسلم قانون کا ایک حصّہ ہے۔ (حالانکہ موصوف کے یہ دونوں دعوے غلط ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ یا تو صحیح اسلامی قانون کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے یا پھر جان بوجھ کر لوگوں کو غلط راہ پر ڈالنا چاہتے ہیں)۔ نیز ان کا مطالبہ ہے کہ ہندستانی عدالتوں کو یہ حق ملنا چاہیئے کہ وہ کسی متعین فقہی مکتبِ فکر کی پابندی کیئے بغیر آزادانہ طور پر مختلف مکاتبِ فکر یا مسلکوں میں سے کسی ایک کے مطابق فیصلہ کر سکیں۔ گویا کہ اپنی مرضی سے جس مسلک کو چاہیں پسند کر کے اسے قطعیت عطا کر دیں۔ ظاہر ہے کہ اگر ہندستانی عدالتوں کو خدانخواستہ یہ اختیار مل گیا تو پھر پوری فقہ اسلامی ایک بازیچۂ اطفال بن کر رہ جائے گی۔

غرض جدید ہندستان کی کوئی بھی مجلسِ مذاکرہ ہو یا قانون دانوں اور دانشوروں کی کوئی بھی

محفل سب جگہ اور سب کے ذہنوں میں بھی دو مسئلے سمائے ہوئے ہیں، جن میں اگر "اصلاح" یا تبدیلی ہوگئی تو پھر نہ صرف مسلمان عورت کی حالت سدھر جائے گی اور اُس کی نجات ہو جائے گی بلکہ ہندستان کی بھی کایا پلٹ جائے گی۔

اصل میں یہ طرزِ فکر مغربی ذہنیت کی پیداوار ہے کہ جہاں بھی اسلامی قانون موجود ہو یا جس ملک میں اُس پر عمل درآمد ہو رہا ہو، اُس میں شکوک وشبہات پیدا کئے جائیں اور بے جا اعتراضات کر کے اُس کو ناقابلِ عمل یا "غیر معقول" قرار دیا جائے۔ اور اس کے لئے یہ لوگ ایک خاص قسم کی ٹیکنک یا حکمتِ عملی سے کام لیتے ہیں، تاکہ لوگ آسانی کے ساتھ ان کے بہکاوے میں آسکیں۔ اس تحریک کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ دُنیا سے آہستہ آہستہ اسلامی قانون پوری طرح مٹ جائے اور اس کی جگہ مغربی قانون یا وضعی قانون لے لے۔ لہٰذا آج مغربی ذہنیت رکھنے والے یا مغربی تحریکوں کے ایجنٹ دُنیا بھر میں اور خاص کر عالمِ اسلام میں پھیلے ہوئے منظم طور پر قلم اور پریس کی قوت سے زہر اُگل رہے ہیں؛ اور چونکہ ایسی تحریکوں کی پُشت پناہی مغربی دُنیا یا اُس کی ذہنیت کر رہی ہے اس لئے وہ اسلامی قانون کو کمزور ثابت کرنے کی راہ میں مسلسل اپنی ساری توانائیاں صرف کر رہے ہیں۔ اور اس سلسلے میں یہ لوگ عوام کو جو سب سے بڑا مغالطہ دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ موجودہ قوانین اصل اسلامی قوانین سے ہٹے ہوئے ہیں۔ لہٰذا انہیں ختم کر کے صحیح اسلامی قوانین رائج کرنا چاہئے۔ اور صحیح اسلامی قوانین ان کی نظر میں وہ ہیں جو آج بعض مسلم ممالک میں اصلاح کے نام پر رائج ہیں، یا جن کو اسلام کے بعض نئے "مفکروں" نے عصرِ جدید سے مطابقت رکھنے والے "ثابت" کیا ہے۔ اور اس حکمتِ عملی کے ذریعہ وہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ یہ لوگ نہ صرف انسانیت کے درد مند اور بہی خواہ نیز عدل ومساوات اور حقوقِ انسانی کے علمبردار ہیں بلکہ انہیں "صحیح" اسلامی قوانین نافذ کرنے کی بھی بڑی "فکر" ہے۔ حالانکہ ان کا مقصد محض عوام کو بہکانا ہوتا ہے تاکہ وہ اسلام کے نام پر اس قسم کی تبدیلی کے لئے آمادہ ہو جائیں۔ بالفاظِ دیگر زہر کو امرت سمجھ کر پی لیں۔ موجودہ دور میں "دین" کے نام پر "بے دینی" کا یہ ایک ایسا حربہ ہے جو موجودہ عیارانہ ذہن ودماغ کی پیداوار ہے۔ اور یہ قلم کا کمال یا جادو ہے کہ ایک سفید

چیز کو سیاہ یا ایک سیاہ چیز کو سفید ثابت کر دیا جائے۔ اور یہ ٹیکنک آج ہر جگہ کامیابی کے ساتھ استعمال کی جا رہی ہے تاکہ بھولے بھالے عوام ان کے دام تزویر میں آسانی کے ساتھ آجائیں۔

موجودہ دور کے وہ مسلم ممالک جہاں پر اسلامی قانون میں "اصلاح" ہوئی ہے وہ بھی دراصل وہاں کے بااقتدار مغربی تعلیم یافتہ یا مغربی قانون پر فریفتہ طبقے کی کارستانیوں کا نتیجہ ہے، جو محض اقتدار کے بل بوتے پر نافذ ہوا ہے۔ اور اس اعتبار سے مخالفِ اسلام تحریکیں دو طرفہ مقاصد کے تحت مصروفِ عمل ہیں: ایک طرف تو وہ مسلم ممالک کے بااقتدار طبقے کو مختلف طریقوں سے اس پر آمادہ کرتی ہیں کہ اسلامی قانون موجودہ دور کے حالات اور تقاضوں سے مطابقت نہیں رکھتا اس لئے اسے بدل کر نیا "ترقی یافتہ قانون" اپنے اپنے ملکوں میں رائج کریں۔ اور چونکہ وہاں کا بااثر طبقہ مغربی فکر سے متاثر رہتا ہے اس لئے اُسے اس کام پر آمادہ کرنے میں بڑی آسانی رہتی ہے۔ اور دوسری طرف وہ ایسے ملکوں کے عوام کو جہاں پر صحیح اسلامی قانون رائج ہے اُنہیں ترغیب دی جاتی ہے کہ دیکھو فلاں فلاں مسلم ملک نے اپنے قانون میں اصلاح کر کے ایک صحیح قدم اٹھایا ہے، لہٰذا دوسروں کو بھی ان کی پیروی کرنی چاہئے۔ مگر جیسا کہ اُوپر عرض کیا گیا وہ اس کو اسلامی قانون میں "تبدیلی" کے بجائے "صحیح اسلام" کی طرف ایک اقدام اور انسانیت کی "فلاح و بہبودی" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس طرح وہ اسلامی قانون کے "اطراف" اپنا گھیرا تنگ سے تنگ کرتے جا رہے ہیں۔

مسلم ممالک میں اس قسم کی تجدد پسندانہ تحریک یا صحیح اسلامی قوانین کو مٹانے کی ابتدا ترکی میں مُصطفیٰ کمال پاشا کے ذریعہ عمل میں آئی، جس نے اسلامی شریعت کو رجعت پسندانہ قرار دے کر ملک بدر کر دیا اور اس کی جگہ (۱۹۲۵ تا ۱۹۳۰ء کے دوران) مغربی قوانین کو رائج کیا۔ کمال اتاترک کے اس اقدام کے پیچھے بہت سے تاریخی و سیاسی اسباب و محرکات کارفرما تھے۔ جن میں سے سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ اُسے عربوں سے اتنی نفرت اور کراہیت پیدا ہوگئی تھی کہ وہ عربوں کی ہر چیز کو اجنبیت کی نظروں سے دیکھتا تھا۔ اسی نفرت کا نتیجہ تھا کہ ترکی میں اُس نے نہ صرف عربی زبان کو ممنوع قرار دے کر رومن رسم الخط اختیار کر لیا بلکہ مسجدوں میں عربی زبان میں اذان دینے پر بھی پابندی عائد کر دی۔

غرض ترکی کا یہ اقدام خواہ کسی بھی سبب کے تحت کیوں نہ عمل میں آیا ہو، مگر اس کے اثرات آہستہ آہستہ دیگر مسلم ممالک پر بھی پڑنے لگے۔ کیونکہ اس اقدام کی وجہ سے مغرب کی پروپگنڈہ مشنری تیز ہوگئی۔ چنانچہ عرب ممالک میں سب سے پہلے مصر نے ۱۹۲۹ء میں اپنے عائلی قوانین FAMILY LAW میں ترمیم کر کے فضا کو سازگار بنایا۔ ۱۹۴۹ء میں شام میں جب فوجی انقلاب آیا تو اُس نے مصر کے جدید مدنی قانون CIVIL LAW کی پیروی میں اسلامی قانون سے اپنا رشتہ منقطع کرلیا۔ اسی طرح یکے بعد دیگرے لبنان، اردن، عراق اور ٹیونیشیہ وغیرہ نے بھی اسلامی قانون کو خیرباد کہہ کر مغرب کے عائلی قوانین کی پیروی شروع کردی اور "ترمیم" و "اصلاح" کے ذریعہ چودہ سوسالہ مُسلّمہ و متفقہ قانون کو بدل کر رکھ دیا۔ لہٰذا "ترقی پسندوں" کا مطالبہ ہے کہ بچے کھچے مسلم ممالک میں بھی یہ "ترقی یافتہ" قانون رائج ہوجائے۔

چونکہ ان سب ممالک میں بااقتدار طبقہ مغرب زدہ ہے اس لئے یہ قوانین اقتدار کے بل بوتے پر عوام پر زبردستی نافذ و مُسلط کئے گئے ہیں۔ اور اسی بنا پر مغربی طبقے کی کارستانیوں کے خلاف شورشیں برپا ہورہی ہیں۔ جیسا کہ ٹیونیشیہ کے حالیہ انقلاب (۷ رنومبر ۱۹۸۷ء) سے ظاہر ہوتا ہے، جہاں پر حبیب بورقیبہ کے مخالفِ اسلام قانون اور ان کے بےجا تشدد کے خلاف برپا ہُوا ہے۔ اسی طرح مصر اور ترکی وغیرہ میں بھی اسلام پسندوں کی تحریکیں کافی تیز ہوگئی ہیں اور مغرب کے مدنی اور عائلی قوانین کے خلاف سخت ردِّ عمل ہورہا ہے۔ غرض آج دنیا بھر میں جہاں کہیں بھی اسلام کے "اصلاح شدہ" قوانین رائج ہیں وہاں پر دوبارہ صحیح اسلامی قوانین کے نفاذ کی مانگ کی جارہی ہے۔ لہٰذا "ترقی پسندی" کے نام پر مُسلمانوں کو مُسلم ممالک کے قوانین اختیار کرنے کی دعوت دینا ایک غیر اُصولی اور گمراہ کن موقف ہے۔

اس جائزے سے بخوبی ظاہر ہوگیا کہ یہ تحریک صرف ہندستان ہی میں نہیں بلکہ پوری دُنیا میں چل رہی ہے اور اس کا خاص نشانہ مُسلم ممالک ہیں۔ اور اس اعتبار سے یہ اسلامیت اور مغربیت کی کش مکش ہے جو ہر جگہ بھیس بدل بدل کر سامنے آتی رہتی ہے۔ لہٰذا اس منظم تحریک کا توڑ بھی اسلام پسندوں کی طرف سے منظم طور پر ہونا چاہئے۔ اور قرآنی نقطۂ نظر سے حکیمانہ بحث و مباحثہ کے ذریعہ دعوتِ اسلامی کا کام جاری رہنا چاہئے۔ (نحل: ۱۲۵) اس اعتبار سے ضرورت ہے کہ اب اسلامی ادارے اور تنظیمیں متحد

ہو کر ایک منظم تحریک چلائیں اور اس باطل تحریک کے مقابلے کے لئے مؤثر اور طاقتور قسم کا لٹریچر مختلف زبانوں میں تیار کر کے پھیلائیں۔ جب تک ہمارے پاس پریس اور نشر و اشاعت کی طاقت نہ ہو مخالفانہ تحریک کا توڑ صحیح طور پر نہیں ہو سکتا۔

راقم سطور نے دہلی کے مذکورۂ بالا سیمنار سے لوٹنے کے بعد ارادہ کیا تھا کہ اسلام میں عورت کے صحیح مقام و مرتبے پر خالص سائنٹفک نقطۂ نظر سے ایک کتاب تیار کی جائے، جس میں ہر غلط دعوے کا جواب خالص علمی اور سائنٹفک نقطۂ نظر سے دیا جائے۔ چنانچہ اس موضوع پر کام شروع کر دیا گیا اور کچھ مباحث لکھے جا چکے تھے کہ شاہ بانو کیس نے ایک دھماکے کی شکل اختیار کر لی اور عنانِ قلم کو دوسری طرف موڑ دیا۔ اس طرح یہ کوشش ادھوری رہ گئی۔ لہٰذا جیسے تیسے کر کے یہ کتاب پیش کی جا رہی ہے۔ انشاء اللہ کچھ فرصت کے لمحات نصیب ہوں تو اصل کتاب بھی بہت جلد پیش کی جائے گی۔ چونکہ سیمنار کا موضوع عورت اور اسلام تھا اس لئے اس کتاب کا نام بھی "عورت اور اسلام" تجویز کیا گیا ہے۔ کیونکہ اس کے مباحث عورت ہی سے متعلق ہیں، یا صحیح معنوں میں موجودہ ذہن نے انہیں عورت سے متعلق قرار دے لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی عورت کے مقام و مرتبے اور اُس کے حقوق کی بحث ہوتی ہے تو لامحالہ طور پر طلاق اور تعددِ ازدواج کے مسائل پر بھی بحث کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ گویا کہ یہ قوانین عورت پر ظلم اور ناانصافی کی علامت ہیں۔ اور اسی اعتبار سے راقم سطور نے بھی ان مسائل پر بحث کرنا اور شبہات و اعتراضات کا جواب دینا ضروری سمجھا ہے۔ انشاء اللہ ان دو مسائل پر بھی راقم سطور کی دو الگ الگ کتابیں بہت جلد منظرِ عام پر آئیں گی۔ عوام کو قانونِ طلاق کے صحیح مسائل سے روشناس کرانے اور انہیں قرآن اور حدیث کی تعلیمات سے واقف کرانے کے لئے بھی ایک کتاب راقم سطور کے قلم سے "اسلام کا قانونِ طلاق" کے نام سے تیار ہو گئی ہے جس کی کتابت شروع ہو چکی ہے۔ تین طلاق کے مسئلے پر تحقیقی نقطۂ نظر سے ایک کتابچہ "تین طلاق کا ثبوت اسلامی شریعت میں" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ اور ایک کتاب "نکاح اور جہیز کے مسائل: اسلامی شریعت میں" شائع ہونے کے قریب ہے۔ غرض راقم سطور ان مسائل و موضوعات پر باقاعدگی کے ساتھ کام کر رہا ہے۔

اسلامی شریعت پر مختلف حیثیتوں سے تحقیقی کام کے لئے ایک علیٰحیدہ شعبہ قائم کرنا بہت ضروری ہے تاکہ یہ کام منظم طور پر ہو سکے۔ اور اس سلسلے میں اکیڈمی کی جانب سے ہم نے ہمدردانِ ملت سے گزارش کی تھی کہ اس کام کی ضرورت و اہمیت کا احساس کرتے ہوئے فی الحال تحقیقی کام کے لئے دو رفقاء کے تقرر کے لئے مالی اعتبار سے ہماری امداد کی جائے۔ مگر اب تک ہماری التجا شرفِ قبولیت حاصل نہیں کر سکی ہے۔ لہٰذا ہم ایک بار پھر دردمندی کے ساتھ اس سلسلے میں گزارش کرتے ہیں کہ وہ ہماری صدا پر لبیک کہتے ہوئے اس تحریک کو پروان چڑھائیں۔ تاکہ ہم موجودہ دور کی ضرورت کے پیش نظر صحیح دینی و علمی خدمت کر سکیں۔ خدا کرے کہ ہماری یہ صدا بیکار نہ جائے۔

محمد شہاب الدّین ندوی

۱۱ر ذی قعدہ ۱۴۰۸ھ

۲۶/ ۶/ ۱۹۸۸ء

عورت کی معاشی و تمدنی سرگرمیاں
اسلام کی نظر میں

موجودہ دور میں تمدنِ جدید نے جو مسائل پیدا کر دئے ہیں ان میں سے ایک نہایت اہم مسئلہ جدید معاشرے میں عورت کی حیثیت اور اس کے مقام و مرتبے کے تعین کا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عورت پر دورِ قدیم میں بہت ظلم ہُوا ہے اور اس کے حقوق نہایت درجہ بے دردی کے ساتھ پامال کئے گئے ہیں۔ مگر اس کے برعکس دورِ جدید میں اس کو نہایت فراخ دلی کے ساتھ "حقوق" کے نام پر اتنی مراعات دئے جا رہے ہیں کہ اس کے فرائض و واجبات کا خانہ ہی خالی ہوتا جا رہا ہے۔ اس طرح دونوں صورتوں میں افراط و تفریط نظر آتی ہے۔ لہٰذا عورت کے ساتھ انصاف یہ نہیں ہے کہ اس کو اس کے اصل دائرۂ کار سے ہٹا کر اس کے فرائضِ منصبی کی ادائیگی سے غافل کر دیا جائے۔ اس کا نتیجہ تمدنِ انسانی کی بربادی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ عورت اور مرد دونوں تمدنِ انسانی کی گاڑی کے دو پہیئے ہیں اگر ان میں سے کوئی ایک پہیہ بھی خراب ہو جائے تو گاڑی آگے نہیں بڑھ سکے گی۔

اس سلسلے میں بنیادی مسئلہ جس کی طرف سے اکثر لوگ اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہیں، یہ ہے کہ کیا عورت اور مرد جسمانی، ذہنی اور نفسیاتی حیثیت سے برابر برابر ہیں؟ ظاہر ہے کہ حقیقت ایسی نہیں ہے اور اثبات کا کوئی بھی مدعی نہیں ہے۔ بلکہ ماہرینِ حیاتیات کی تحقیق کے مطابق عورت جسمانی اعتبار سے بہ نسبت مرد کے بہت کمزور ہے۔ اور عورت کی یہ کمزوری اس لئے نہیں ہے کہ وہ مرد کی مطیع اور اس کی دست نگر بنی رہے بلکہ اس کا وظیفۂ طبعی اس سے زائد قوت کا متحمل ہی نہیں ہو سکتا جو فطرت نے اس کے سپرد کیا ہے۔ لہٰذا عورت مرد کی ہم پلہ بننے کی ہزار کوشش کرے وہ اس مرتبے تک ہرگز نہیں پہنچ سکتی۔ تفصیل کے لئے دیکھئے علامہ فرید وجدی کی معرکۃ الآرا کتاب "المرأۃ المسلمۃ" جس کا ترجمہ مولانا ابوالکلام آزاد نے "مسلمان عورت" کے نام سے کیا ہے۔

علامہ موصوف نے اپنی اس وقیع کتاب میں نہایت فاضلانہ طور پر ان تمام دلائل کا جائزہ لیا ہے جن کو آزادیٔ نسواں کے علمبردار پیش کرتے ہیں۔ اور خود علمائے یورپ کی تحقیقات اور ان کے اقوال و آراء کی روشنی میں اس بے بنیاد نظریہ کا مدلل طور پر رد کیا ہے کہ عورت ہر حیثیت سے مرد کی مساوی ہے اور اس کو ہر قسم کی معاشرتی، معاشی اور تمدنی آزادی حاصل ہونی چاہئے۔ نیز انہوں نے ان نظریات و تحریکات کے فروغ کے باعث یورپ کے مختلف ممالک میں اس کے جو لازمی اور خوفناک نتائج رُونما ہُوئے ان سب کا بھی جائزہ لیتے ہُوئے مستند اور ناقابلِ تردید حقائق پیش کئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ آج عورت کی مکمل آزادی اور بے مہاری کے باعث مغربی ممالک میں جو حد درجہ افسوسناک معاشرتی، اخلاقی اور تمدنی خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں ان سے خود دانشورانِ یورپ تک پریشان ہیں اور علاج کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ بلکہ یہ ایک لاعلاج مرض اور تہذیبِ جدید کا ناسور بن چکا ہے۔ یہ تہذیبِ جدید کی وہ آگ ہے جو اب مشرقی ممالک کو بھی جھلسانے لگی ہے۔

اسلام کا موقف

جہاں تک اسلام کا تعلق ہے اس نے عورت اور مرد کی فطرت اور ان کی ساخت و پرداخت کا لحاظ رکھتے ہُوئے دونوں کو نہایت درجہ متوازن اور جامع حقوق عطا کئے ہیں۔ اور دونوں کے فرائض و واجبات کا بھی پوری انصاف پسندی کے ساتھ تعین کیا ہے۔ خصوصاً عورت چونکہ زمانۂ قدیم سے ایک مظلوم اور ستم رسیدہ ہستی چلی آرہی تھی۔ اس لئے اسلام نے عورت کے حقوق کا تعین اس کی فطرت کے تقاضے کے مطابق منصفانہ طور پر کیا ہے۔ اسلامی قوانین میں قدیم قوموں کے تمدنی قوانین کی طرح نہ افراط ہے اور نہ تہذیبِ جدید کے قوانین کی طرح تفریط، جو عورت کو سبز باغ دکھا کر اس کو گھر سے بے گھر کرنا، اور اس کو دربدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کرنا چاہتی ہے، تاکہ وہ مرد کے ہاتھوں میں ایک کھلونا بن کر اس کے اشاروں پر ناچ سکے۔

بہرحال اسلام میں عورت اور مرد دونوں انسان ہونے کی حیثیت سے مساوی مقام و مرتبہ رکھتے ہیں۔ اور جہاں تک ان کے فرائض و واجبات کی ادائیگی کا تعلق ہے دونوں کا دائرۂ کار الگ الگ

ہے۔ اسلام نے کنبے اور خاندان کا بوجھ یعنی معاشی ذمہ داریاں فطرت کے فیصلے کے مطابق مرد کے سپرد کی ہیں۔ اور گھریلو انتظام و انصرام کا بار بوجھ اس کی جسمانی ساخت کے مطابق عورت کے ذمہ کیا ہے۔ ان دونوں کے ذہنی، جسمانی اور نفسیاتی حقائق کے اعتبار سے یہ ایک صحیح اور فطری دائرہ کار ہے، اور اس میں کسی ایک کی بھی توہین و اہانت کا کوئی بھی پہلو نہیں ہے۔ کیونکہ نہ تو خود مرد ہی اپنی جگہ پر "مکمل" ہے اور نہ ہی عورت اپنی جگہ پر "کامل ہستی" ہو سکتی ہے۔ بلکہ ان دونوں کے ملاپ ہی سے ایک "کامل شخصیت" وجود میں آتی ہے۔

علامہ فرید وجدی لکھتے ہیں:

"عورت کو وہ قوتیں عطا کی گئی ہیں جو اس کے قدرتی فرض کی انجام دہی میں مدد دیں۔ اور مرد کو جسمانی و عقلی قویٰ کی وہ طاقت بخشی گئی ہے جو اس کے تمدنی فرائض کی بجا آوری کا ذریعہ ہوں۔ پس اس حیثیت سے دونوں جنسوں کا درجہ "مساوی" ہے اور دونوں نظامِ کائنات میں برابر کا حصہ رکھتے ہیں۔"[1]

مرد عورت کا کفیل ہے

اس فطری تقسیم عمل کے مطابق اسلام نے معاشی جدوجہد اور اہل و عیال کی ذمہ داریوں کا بوجھ براہِ راست مرد پر ڈالا ہے اور اسی اعتبار سے مرد ہی کو گھر اور خاندان کا منتظم اور ناظم اعلیٰ قرار دیا ہے۔

اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَا اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ : مرد عورتوں پر حاکم ہیں۔ کیونکہ اللہ نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت بخشی ہے۔ اور اس وجہ سے بھی کہ مرد اپنا مال (عورتوں پر) خرچ کرتے ہیں۔ لہٰذا (مردوں کی اس فطری برتری کا تقاضا ہے کہ) عورتیں صالح اور فرمانبردار بنیں۔ (سورۂ نساء: ۳۴)

اور حدیث شریف کی تصریح کے مطابق عورت کا نفقہ ہر حال میں مرد پر فرض قرار دیا گیا ہے، حتیٰ کہ عورت اپنا نفقہ نہ ملنے کی صورت میں مرد سے طلاق تک کا مطالبہ کر سکتی ہے:

---

[1] مسلمان عورت، ترجمہ از مولانا ابوالکلام آزاد، ص ۶۸، دہلی

تَقُولُ المرأةُ إمّا أن تُطعِمني وَ إمّا ان تُطلِقني: عورت کہتی ہے کہ یا تو تم مجھے کھانا دو یا (سیدھی طرح) طلاق دے دو۔[2]

بعض دیگر احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ شوہر جب بیوی بچوں پر حسب ضرورت خرچ نہ کرتا ہو، یا بخل سے کام لیتا ہو یا وہ غائب ہو تو بیوی کو اختیار ہے کہ وہ شوہر کے مال میں سے اس کی اجازت کے بغیر حسب ضرورت اپنا خرچ لے سکتی ہے۔ بلکہ اس کو اس فعل پر نصف اجر و ثواب بھی ملے گا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوسفیان کی بیوی ہندہ بنت عتبہؓ کی شکایت پر اجازت دیتے ہوئے فرمایا:

خُذِي مَا يَكْفِيكِ وَوَلَدَكِ بِالْمَعْرُوفِ: اپنے شوہر کے مال سے معروف طور پر اتنا لے لو جو تمہارے اور تمہارے بچوں کے لئے کافی ہو جائے۔[3]

نیز ایک دوسری حدیث میں ہے:

إِذَا أَنْفَقَتِ الْمَرْأَةُ مِنْ كَسْبِ زَوْجِهَا غَيْرَ أَمْرِهِ فَلَهُ نِصْفُ أَجْرِهِ: جب عورت اپنے شوہر کے مال میں سے اس کی اجازت کے بغیر خرچ کرتی ہے تو اس کو نصف اجر ملے گا۔[4]

اور حجۃ الوداع کے موقع پر آپؐ نے جو تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا، جس میں اسلامی تمدن و معاشرت کے نہایت اہم اصول بیان کئے گئے ہیں، اس میں بھی آپؐ نے نہایت صراحت کے ساتھ فرمایا:

أَلَا وَحَقُّهُنَّ عَلَيْكُمْ أَنْ تُحْسِنُوا إِلَيْهِنَّ فِي كِسْوَتِهِنَّ وَطَعَامِهِنَّ: ہاں دیکھو ان عورتوں کا تم پر حق یہ ہے کہ تم ان سے ان کے کھانے کپڑے میں اچھا برتاؤ کرو۔[5]

ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ اسلامی شریعت کی رو سے معاشی جد و جہد کی ذمہ داری اصلاً مرد پر ڈالی گئی ہے اور وہی اپنے بال بچوں کا کفیل ہے۔ اور جدید عائلی قانون میں بھی عورت کا نفقہ مرد ہی

---

[2] بخاری کتاب النفقات

[3] بخاری کتاب النفقات

[4] بخاری کتاب النفقات

[5] جامع ترمذی

کے ذمے واجب قرار دیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ موجودہ سیکولر عدالتوں کے ذریعہ بھی مطلقہ عورت تک کو، جب تک کہ وہ دوسری شادی نہ کرلے مرد ہی سے نان نفقہ دلایا جاتا ہے۔

عورت مجبوری کی صورت میں کیا کرے؟

مگر اس کے باوجود عورت کو بیوہ ہونے کی صورت میں یا شوہر کی تنگدستی کی وجہ سے یا کسی اور مجبوری کی بنا پر تلاشِ معاش کی ضرورت پڑ سکتی ہے جب کہ اُس کا کوئی دوسرا کفیل یا سہارا نہ ہو یا کوئی اسلامی ملک یا معاشرہ اس کی کفالت کرنے والا موجود نہ ہو۔ ایسی صورت میں اس کو اجازت ہوگی کہ وہ حالات کا اندازہ کر کے اپنے لئے کوئی ذریعۂ معاش اختیار کرے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی حکیمانہ شریعت میں اس باب میں کسی قسم کی ممانعت نہیں آئی ہے۔ بلکہ صحابۂ کرامؓ کے بعض واقعات کی روشنی میں ہمیں اس باب میں کافی رہنمائی ملتی ہے۔ جیسا کہ تفصیل آگے آئے گی۔ مگر یہ بات ہر فرد اور خاندان کے اپنے مخصوص حالات کی بنا پر ہوگی۔ یہ نہیں کہ اس شخصی و انفرادی ضرورت کو پوری طرح قوم پر اجتماعی حیثیت سے مسلط کر دیا جائے۔

بہرحال اس صورت میں عورت پر دو قسم کی پابندیاں ہر حال میں ضروری ہوں گی۔ ایک یہ کہ وہ اپنے اصل دائرہ کار میں رہتے ہوئے شوہر اور بچوں کے حقوق پوری طرح ادا کرتی ہو — اور — دوسرے یہ کہ وہ اسلامی ضابطۂ اخلاق کے مطابق تمام تہذیبی و تمدنی پابندیوں کو اپنے اُوپر عائد کرنے والی ہو۔ تاکہ اسلام نے جو خاندانی اور عائلی نظام بنایا ہے اس میں کسی قسم کا رخنہ پیدا نہ ہو اور اسلامی معاشرہ کی تعمیر صالح بنیادوں پر ہو سکے۔

مگر عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ وہ عورتیں جو آج کل معاشی میدان میں کود کر مردوں کے ساتھ مسابقت کر رہی ہیں وہ ان تمام ضوابط سے آزاد نظر آتی ہیں اور گھریلو ذمہ داریوں سے بھی — اکثر و بیشتر — گریز و فرار اختیار کر رہی ہیں جس کی وجہ سے طرح طرح کے معاشرتی و تمدنی مفاسد پیدا ہوئے ہیں۔ اور تمدنِ جدید کی یہ عجیب حکمتِ عملی نظر آتی ہے کہ مردوں کو بیکار رکھتے ہوئے عورتوں کو نوکری کرنے کی ترغیب دی جائے اور انہیں گھر سے بے گھر کیا جائے۔ عورتوں کی نوکری یا کسبِ معاش کا مسئلہ تمدنِ جدید کا

پیدا کردہ ایک مصنوعی مسئلہ ہے جس کے پیچھے کوئی ٹھوس حقیقت و ضرورت دکھائی نہیں دیتی بلکہ عورت کے لئے یہ ایک غیر وضعی چیز نظر آتی ہے جس کے چکر میں پڑ کر عورت عورت نہیں رہتی۔

عورت اور مرد کے حدود

بہرحال اس موضوع پر کچھ عرض کرنے سے پہلے یہ دیکھنا نہایت ضروری ہے کہ اسلام نے عورت کو کیا حقوق عطا کئے ہیں اور اس پر کیا کیا فرائض اور پابندیاں عائد کی ہیں۔ کیونکہ یہ مسئلہ سرسری طور پر طے نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ اس کے تمام پہلوؤں پر نظر ڈالنے کے بعد ہی کسی نتیجے تک پہنچا جاسکتا ہے۔

اسلام چونکہ ایک حقیقت پسندانہ مذہب ہے، جس کے تمام قوانین نظام فطرت کے تقاضوں کے عین مطابق ہیں، اس لئے اس نے عورت اور مرد کے اجتماع کے تعلق سے چند حدود قائم کئے ہیں اور چند معاشرتی پابندیاں عائد کی ہیں، تاکہ سوسائٹی میں کسی قسم کی بے اعتدالی یا مفسدہ پیدا نہ ہو۔ اور ہر قسم کے شر و فساد کا سدِّباب ہوسکے۔ اس سلسلے میں سب سے بڑی اور بنیادی پابندی جو اس نے عائد کی ہے وہ یہ ہے کہ معاشرے میں مرد اور عورت کا آزادانہ میل جول رہنے نہ پائے، جو تمام فتنوں کی جڑ اور اُمّ الفساد ہے۔ لہٰذا وہ عورت کو پردے اور حجاب میں رہنے کا حکم دیتا ہے اور ہر قسم کے غیر محرم اور اجنبی مردوں سے میل ملاپ قائم کرنے کی سختی کے ساتھ ممانعت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عورت کو آزادانہ کسبِ معاش سے روکتا ہے اور یہ ذمہ داری مرد کے اُوپر ڈالتا ہے۔ کیونکہ عورت حجاب میں رہتے ہُوئے اور دیگر اخلاقی و معاشرتی حدود و ضوابط کو برقرار رکھتے ہُوئے اس فریضے کو صحیح طور پر انجام نہیں دے سکے گی۔ اور پھر دوسری حیثیت سے عورت معاشی ذمہ داریوں کی چکّر میں پھنس کر اپنے اصل فرائض سے غافل ہوجائے گی، جس کا نتیجہ سوائے خاندان اور تمدّن کی بربادی کے اور کچھ نہیں ہوسکتا، جیسا کہ ماہرینِ تمدّن و اجتماع کی رائے ہے۔ اس حیثیت سے دیکھا جائے تو پردہ عورت کے لئے کوئی ذلّت کی بات یا اس کے قیدی ہونے کی علامت نہیں بلکہ اس کے حفظِ ناموس کے لئے ایک ڈھال کی حیثیت رکھتا ہے۔ ماہرینِ اخلاق کی رائے ہے کہ بُرائیوں کی روک تھام کے لئے سب سے پہلے اُن ذرائع و وسائل کی روک تھام ضروری ہے جو ان بُرائیوں تک لے جانے والے ہوں۔

عورت کے حقوق

اس تفصیل و وضاحت کے بعد آیئے دیکھیں کہ اسلام نے عورت کو کیا حقوق عطا کئے ہیں اور اس پر کون سی اخلاقی و تمدنی پابندیاں عائد کی ہیں جن کی بنا پر وہ معاشرے میں معزز رہتے ہوئے اپنی عزت و ناموس کی حفاظت کر سکتی ہو اور نوخیز نسلوں کی بہتر سے بہتر تربیت کرتے ہوئے ایک صالح معاشرہ کو پروان چڑھا سکتی ہو۔ یہ جائزہ اس لئے بھی ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر اسلام میں عورت کی صحیح حیثیت اور اس کے دائرۂ کار کا تعین کرنا نہایت دشوار ہے۔

عورت چونکہ تمدنِ انسانی کا مرکز و محور اور باغِ انسانیت کی زینت ہے اس لئے اسلام نے اُس کو باوقار طریقے سے وہ تمام معاشرتی حقوق عطا کئے جس کی وہ مستحق تھی۔ چنانچہ اُس کو اپنے گھر کی ملکہ قرار دیا۔ دیگر بہت سی قوموں کے برعکس اپنا ذاتی مال و ملکیت رکھنے کا حق عطا کیا۔ شوہر سے ناچاقی کی صورت میں خلع کا حق دیا۔ نکاحِ ثانی کرنے کی اجازت دی۔ وراثت میں اس کو حصہ دلایا اور اس کو بعض قوموں کی طرح نجس و ناپاک نہیں بلکہ معاشرے کی قابلِ احترام ہستی قرار دیا۔ غرض اس نے "وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ" کہہ کر اس کے وہ تمام حقوق بحال کر دئے جو اقوامِ عالم نے معطل کر دئے تھے۔ یعنی دستور کے مطابق عورتوں پر جس طرح کی ذمہ داریاں ہیں اسی طرح ان کے حقوق بھی ہیں۔ یہ نہیں کہ اُن کے ذمے محض فرائض ہی فرائض ہوں اور ان کا کوئی بنیادی حق ہی نہ ہو۔

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ: "ہم زمانۂ جاہلیت میں عورتوں کو کوئی چیز نہیں سمجھتے تھے یعنی معاشرے میں ان کی کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔ مگر جب اسلام آیا اور اللہ تعالیٰ نے عورتوں کا (خصوصی اہمیت کے ساتھ) تذکرہ کیا تب کہیں جاکر ہمیں احساس ہُوا کہ ہم پر عورتوں کا بھی کوئی حق ہو سکتا ہے"[۱]

محسنِ انسانیت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پست طبقے کے ساتھ حُسنِ سلوک کرنے پر یہاں تک اُبھارا کہ اس کو ایمان جیسی اعلیٰ ترین شے کا ضروری جزو قرار دے دیا۔

اَكْمَلُ الْمُؤْمِنِيْنَ اِيْمَانًا اَحْسَنُهُمْ خُلُقًا وَخِيَارُكُمْ خِيَارُكُمْ لِنِسَاءِهِمْ:

---

[۱] ملاحظہ ہو بخاری کتاب اللباس، باب ۳۱

ایمان کے اعتبار سے کامل ترین شخص وہ ہے جس کے اخلاق سب سے زیادہ اچھے ہوں۔ اور تم میں سب سے بہتر لوگ وہ ہیں جو اپنی عورتوں کے ساتھ بہتر سلوک کرنے والے ہوں۔[۶]

اسلام کی نظر میں عورت نجس و ناپاک یا پیروں تلے روندی جانے والی ہستی نہیں بلکہ دُنیا کی سب سے زیادہ قیمتی اور گراں مایہ شے ہے۔

اَلدُّنْیَا كُلُّهَا مَتَاعٌ، وَخَيْرُ مَتَاعِ الدُّنْيَا الْمَرْأَةُ الصَّالِحَةُ : دنیا کُل کی کُل ایک اثاثہ ہے۔ اور اس کا بہترین اثاثہ نیک سیرت بیوی ہے۔[۸]

اسلام نے عورت کا مرتبہ یہاں تک بڑھا دیا کہ اپنی بیوی کے حقوق ادا کرنا خُدا کے حقوق کو ادا کرنے کے برابر قرار دے دیا۔

اِنَّ لِرَبِّكَ عَلَيْكَ حَقًّا، وَلِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا، وَلِاَهْلِكَ عَلَيْكَ حَقًّا، فَاَعْطِ كُلَّ ذِي حَقٍّ حَقَّهُ : یقیناً تجھ پر تیرے رب کا بھی حق ہے، تیرے نفس کا بھی حق ہے، اور تیری بیوی کا بھی حق ہے۔ لہٰذا تُو ہر ایک حقدار کا حق (پوری طرح) ادا کر۔[۹]

اسلام کی نظر میں اہل وعیال پر خرچ کرنا بھی عبادت اور جہاد کے برابر ہے۔ حتیٰ کہ بیوی کے مُنہ میں لقمہ دینے کا بھی اجر و ثواب دیا جائے گا۔

اِنَّكَ لَنْ تُنْفِقَ نَفَقَةً تَبْتَغِي بِهَا وَجْهَ اللهِ اِلَّا اُجِرْتَ عَلَيْهَا فِي مَا تَجْعَلُ فِي فَمِ امْرَأَتِكَ : تم اللہ کی رضامندی حاصل کرنے کی خاطر جو بھی خرچ کرو گے اُس کا اجر و ثواب دیا جائے گا، یہاں تک کہ جو لقمہ تم اپنی بیوی کے مُنہ میں ڈالو گے اُس کا بھی۔[۱۰]

دُنیا کی بعض قومیں عورت کو حائضہ ہونے کی صورت میں منحوس تصور کرتے ہُوئے گھر سے باہر کر دیتی

---

[۶] ترمذی

[۸] مسند احمد، ۲/۱۶۸

[۹] بخاری کتاب الادب، باب ۶،

[۱۰] بخاری کتاب الایمان، باب ۴۱

تھیں۔ اسلام نے اس ظالمانہ اور جاہلانہ طریقے کی نفی کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ اہلِ خانہ کے ساتھ رہ سکتی ہے اور سوائے مباشرت کے بقیہ تمام اُمورِ بیت انجام دے سکتی ہے۔ وَاصْنَعُوا كُلَّ شَيْءٍ غَيْرَ النِّكَاحِ۔[11]

اسلام میں کسی بالغ لڑکی کا نکاح اس کی مرضی کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔ حتیٰ کہ باپ تک کو اپنی بالغ لڑکی کا نکاح زبردستی کسی کے ساتھ کر دینے کا اختیار نہیں ہے۔ اِذَا زَوَّجَ اِبْنَتَهُ وَهِيَ كَارِهَةٌ فَنِكَاحُهُ مَرْدُوْدٌ۔[12]

عورت کے فرائض

یہ عورت کے حقوق پر ایک اجمالی نظر ہے۔ اب عورت کے چند فرائض بھی ملاحظہ فرمائیے جو اسی طرح حقیقت پسندانہ ہیں جس طرح کہ اس کے حقوق۔ اور اس کے حقوق و فرائض میں ہمیں کامل درجے کا توازن نظر آتا ہے جس کی بنیاد پر ایک مضبوط خاندانی نظام تشکیل پاتا ہے اور نوعِ انسانی کے ان آشیانوں سے حقیقی مسرّتوں کے سرچشمے پھوٹتے ہیں جو تمام ابدی سعادتوں کا منبع ہیں۔ اور نتیجے کے طور پر پورا معاشرہ امن و سکون کا سانس لیتا ہے اور ملک و قوم کے بازو مضبوط و مستحکم ہوتے ہیں۔

۱۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی حقیقت، اور سب سے پہلا فریضہ یہ ہے کہ عورت اگرچہ اپنی بنیادی ضروریات کی ادائیگی کے لئے گھر سے باہر نکل سکتی ہے، مگر اس کا اصلی دائرہ کار اُس کے شوہر کا گھر ہے، جس کی نگرانی اور دیکھ بھال کی وہ ذمہ دار قرار دی گئی ہے۔

كلكم راع وكلكم مسئول عن رعيته ..... والرجل راع فی اهله وهو مسئول عن رعيته، والمرأة راعية فی بيت زوجها ومسئولة عن رعيتها : تم میں سے ہر شخص ذمہ دار ہے اور ہر شخص سے اس کی ذمہ داری کے متعلق باز پرس کی جائے گی۔ چنانچہ مرد اپنے اہل و عیال کے بارے میں ذمہ دار ہے اور اس سے اس کی ذمہ داری سے متعلق پوچھا جائے گا۔ اسی طرح عورت بھی اپنے شوہر کے گھر کی ذمہ دار ہے اور اس سے اس کی ذمہ داری کے متعلق باز پرس کی جائے گی۔[13]

---

[11] ابوداؤد کتاب الطہارۃ۔

[12] ابوداؤد کتاب النکاح۔

[13] بخاری کتاب الجمعۃ باب ۱۱۔

اُوپر گزر چکا ہے کہ مرد عورت کے اخراجات کا کفیل اور ذمہ دار ہے۔ لہٰذا قدرتی طور پر عورت کو اس کے عوض میں شوہر کے گھر کی نگران اور ذمہ دار قرار دیا گیا ہے۔ مگر عورت کی یہ تابعداری اس کے قیدی یا اسیر ہونے کی علامت نہیں بلکہ دراصل وہ گھر کی ملکہ ہے۔ اور موجودہ دور کے فتنوں کو دیکھتے ہوئے اسی میں اس کی عافیت نظر آتی ہے۔

۲۔ جس طرح مرد سے کہا گیا ہے کہ اپنی بیوی کے حقوق ادا کرنا خدا کے حقوق کی ادائیگی کے برابر ہے، اسی طرح عورت سے بھی کہا گیا کہ شوہر کے حقوق کی ادائیگی خدا کے حقوق ہی کی طرح بلکہ اس سے بھی مقدم ہے۔ لَا تُؤَدِّي الْمَرْأَةُ حَقَّ رَبِّهَا حَتّٰى تُؤَدِّيَ حَقَّ زَوْجِهَا : عورت اپنے رب کے حقوق ادا نہیں کر سکتی جب تک کہ وہ اپنے شوہر کے حقوق ادا نہ کرے[۱۴]۔

اس بیان سے شوہر کے حقوق کی اہمیت اور تاکید دکھانا مقصود ہے کہ اگر کوئی عورت اپنے شوہر کے حقوق پامال کرتے ہوئے اللہ کی عبادت میں بھی لگی رہے تب بھی اس کی عبادت قبول نہیں کی جائے گی۔

۳۔ عورت اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر کسی کو اس کے گھر میں آنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔ وَلَا تَاْذَنُ فِيْ بَيْتِهٖ اِلَّا بِاِذْنِهٖ[۱۵]

۴۔ عورت اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر کسی سے کوئی ہدیہ قبول نہیں کر سکتی۔ لَا يَجُوْزُ لِامْرَأَةٍ عَطِيَّةٌ اِلَّا بِاِذْنِ زَوْجِهَا[۱۶]

۵۔ عورت اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر نفل روزہ نہیں رکھ سکتی، جب کہ اس کا شوہر گھر میں موجود ہو۔ کیونکہ اس کی وجہ سے مرد کے حقوق کی ادائیگی میں فرق آسکتا ہے۔ لَا تَصُوْمُ الْمَرْأَةُ وَ بَعْلُهَا شَاهِدٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ[۱۷]

---

[۱۴] ابنِ ماجہ، ابواب النکاح ۸۴۔

[۱۵] بخاری، کتاب النکاح، باب ۸۶۔

[۱۶] ابوداؤد، نسائی، ابنِ ماجہ۔

[۱۷] بخاری، کتاب النکاح۔

۶۔ جس طرح مرد کو اپنی شریکِ حیات کی دیکھ بھال اور اس کی خاطر و مدارت کرنے کی سخت تاکید کی گئی ہے، اسی طرح عورت کو بھی اپنے خاوند کی رضامندی کا خیال رکھنے اور اس کی نافرمانی و ناراضگی سے بچنے پر زور دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ کوئی عورت اپنے خاوند کو ناراض کر کے جنّت میں نہیں جا سکتی۔ اَیُّمَا اِمْرَأَۃٌ مَاتَتْ وَزَوْجُھَا عَنْھَا رَاضٍ دَخَلَتِ الْجَنَّۃَ: جس عورت کا اس حال میں انتقال ہو کہ اس کا شوہر اس سے راضی رہا ہو تو وہ جنت میں داخل ہو جائے گی [۱۸]

نیز رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ "اگر میں اللہ کے سوا کسی اور کے لئے سجدہ کرنے کی اجازت دیتا تو میں کہتا کہ عورت اپنے شوہر کو سجدہ کرے"[۱۹]

بعض حدیثوں میں آتا ہے کہ عورتیں اپنے خاوندوں کی ناشکری کی بنا پر زیادہ تر دوزخ میں جائیں گی۔ کیونکہ ان میں اپنے شوہروں کی ناشکری و نافرمانی کی عادت زیادہ ہوتی ہے۔

عورت پر چند تمدّنی پابندیاں

یہ ہے اسلام میں عورت کے مقام و مرتبے کی ایک جھلک۔ اس جائزے سے یہ ظاہر ہو گیا کہ دُنیا کی بہت سی قدیم قوموں کے برعکس اسلام عورت کو معاشرے میں کتنا اُونچا مقام عطا کرتا ہے اور اس مظلوم ہستی کو جو اسلام سے قبل پیروں تلے روندی جا رہی تھی اور معاشرے میں اس کی کوئی حیثیت ہی نہیں تھی، کس قدر عزّت و شرف عنایت کرتا ہے! مگر چونکہ اسلام معاشرے کی فلاح و بہبود کا داعی اور تکمیلِ انسانیت کا علمبردار ہے، اس لئے وہ عورت کو شمعِ محفل بننے اور فتنہ و فساد کا محرک قرار پانے کی کبھی اجازت نہیں دے سکتا۔ جس طرح کہ تہذیبِ جدید کے علمبرداروں نے عورت اور مرد کے فطری حدود کو برقرار نہ رکھتے ہوئے محض اپنے سفلی جذبات کی تسکین کی خاطر ایک مصنوعی معاشرہ تعمیر کرنے کی راہ میں اختیار کر رکھا ہے۔

لہٰذا وہ عورت پر چند مزید اخلاقی و تمدّنی پابندیاں بھی عائد کرتا ہے تاکہ انسانی معاشرے میں شر و فساد کا کوئی خطرہ ہی باقی نہ رہے اور ہر ایک اپنے اپنے حدود میں رہ کر ایک بہتر معاشرے کی تعمیر کر سکیں۔

---

[۱۸] ترمذی، ابواب الرضاع۔

[۱۹] ترمذی، ابن ماجہ۔

لہٰذا ان میں سے بعض ضوابط کا تذکرہ اس موقع پر ناگزیر معلوم ہوتا ہے جن کو مختصراً بیان کیا جاتا ہے :

۱۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا اسلام کی نظر میں عورت کا پردہ اور حجاب ضروری ہے تاکہ معاشرے میں ادنیٰ سے ادنیٰ درجے کے فساد کا احتمال بھی باقی نہ رہے۔ یہ موقع چونکہ پردے پر تفصیلی بحث کا نہیں ہے اس لئے اس موقع پر صرف چند احکام کے بیان کر دینے پر اکتفا کیا جائے گا۔

قرآن حکیم نے ازواجِ مطہرات، بناتِ طیبات اور عام مومن عورتوں کو حکم دیا ہے کہ وہ جب کسی ضرورت سے گھر سے باہر نکلیں تو اپنے چہروں پر گھونگھٹ ڈال لیا کریں۔

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ : اے نبی اپنی بیویوں، بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دو کہ وہ اپنے چہروں پر اپنی چادروں میں سے گھونگھٹ نکال لیا کریں۔ (سورۂ احزاب : ۵۹)

دُنیا میں جتنے بھی جھگڑے فسادات ہوتے ہیں وہ زر، زن اور زمین کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ مگر ان میں فتنۂ زن یعنی حُسن و جمال کا فتنہ سب سے زیادہ بڑھا ہوا ہے۔ اسی وجہ سے شارع علیہ السلام نے فرمایا :

" عورت جب گھر سے باہر نکلتی ہے تو شیطان اس کے پیچھے لگ جاتا ہے تاکہ اس کی وجہ سے فتنہ برپا کر سکے "

اَلْمَرْاَۃُ عَوْرَۃٌ ، فَاِذَا خَرَجَتْ اِسْتَشْرَفَهَا الشَّیْطَانُ : عورت پوشیدہ رکھی جانے والی چیز ہے۔ یعنی اس کے لئے پردہ ضروری ہے۔ کیونکہ جب وہ گھر سے نکلتی ہے تو شیطان اس کو تاکتا ہے۔ [۲]

۲۔ یہی وجہ ہے کہ اجنبی مردوں کو کسی عورت سے تنہائی میں ملنے کی سختی کے ساتھ ممانعت کی گئی ہے، اِلّا یہ کہ ان کے ساتھ کوئی ذی محرم شخص بھی موجود ہو۔ اور ذی محرم وہ ہے جس کے ساتھ اس کا نکاح نہ ہو سکتا ہو، جیسے باپ، بھائی، بیٹا، بھتیجہ اور بھانجہ وغیرہ۔

---

[۲] ترمذی : ابواب الرضاع۔

لَا یَخْلُوَنَّ رَجُلٌ بِامْرَأَةٍ اِلَّا مَعَ ذِیْ مَحْرَمٍ : کوئی شخص کسی عورت سے تنہائی میں نہ ملے مگر یہ کہ اس کے ساتھ اس عورت کا کوئی ذی محرم شخص بھی موجود ہو۔[۲۱]

لا یخلون رجل بامراۃ اِلّا وکان ثالثھما الشیطان : جب کبھی کوئی شخص کسی عورت سے تنہائی میں ملتا ہے تو اُن کے ساتھ شیطان تیسرے فرد کی حیثیت سے شریک رہتا ہے۔[۲۲]

۳۔ کسی ذی محرم شخص کے بغیر عورت تنہا ایک دن اور رات کا سفر نہیں کر سکتی۔ لا یحل لامرأۃ تؤمن باللہ والیوم الاخران تسافر مسیرۃ یوم ولیلۃ لیس معھا حُرمۃ : کسی ایسی عورت کے لئے جو اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہو جائز نہیں ہے کہ وہ ایک دن اور رات کا سفر بغیر ذی محرم کے کرے۔[۲۳]

۴۔ عورت کے لئے بن ٹھن کر بازاروں میں نکلنا اور اپنے حُسن وجمال کی نمائش کرنا سخت منع ہے، جس کو قرآن "تبرج جاہلیت" کا نام دیتا ہے۔

وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاھِلِیَّۃِ الْاُوْلٰی : اور اپنے گھروں میں وقار کے ساتھ رہو اور قدیم زمانۂ جاہلیت کی طرح اپنے بناؤ سنگار دکھاتی نہ پھرو۔ (احزاب : ۳۳)

شارع علیہ السلام نے فرمایا کہ "جو عورت غیر مردوں میں اپنی زینت دکھاتی پھرے اس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہوگا۔" مثل الرافلۃ فی الزینۃ فی غیر اھلھا کمثل ظلمۃ یوم القیٰمۃ لانورلھا : غیر مردوں میں اپنی زینت کی نمائش کرنے والی کی مثال ایسی ہے جیسے قیامت کے دن کی ظلمت، جس میں کوئی روشنی نہ ہو۔[۲۴]

نیز آپ نے فرمایا کہ "جو عورت خوشبو لگا کر مسجد کو جائے اس کی نماز قبول نہیں ہو سکتی، جب تک

---

[۲۱] بخاری۔ کتاب النکاح باب ۱۱۱۔

[۲۲] ترمذی کتاب الرضاع باب ۱۹۔

[۲۳] بخاری۔ ابواب التقصیر۔

[۲۴] ترمذی کتاب الرضاع۔

وہ اُس خوشبو کو اچھی طرح دھو نہ ڈالے"۔ [۲۵]

۵۔ عورت جمعہ کی نماز میں شریک نہیں ہوسکتی اور جنازے کے پیچھے نہیں چل سکتی کیونکہ یہ دونوں اُمور اُس کے فرائض سے ساقط ہیں۔ اس کی وجہ بھی ظاہر ہے کہ اُس کو پبلک مقامات میں آنے سے روکنا ہے۔

ونھی عن اتباع الجنائز، ولا جمعة علینا۔ اُم عطیہ کہتی ہیں کہ "ہم کو جنازوں کے پیچھے چلنے سے منع فرمایا۔ اور ہم پر جمعہ بھی نہیں ہے۔" [۲۶]

۶۔ اسلام کے نزدیک عورت کو محض عورت رہنا چاہیئے۔ کسی عورت کو مردوں سے ریس کرنا یا مردوں کے کاموں میں دخل دینا تو درکنار کسی بھی حیثیت سے مردوں کی مشابہت اختیار کرنے سے بھی روکا گیا ہے تاکہ معاشرے میں کسی بھی قسم کا التباس کبھی پیدا ہونے نہ پائے۔ اسی طرح مردوں کو بھی عورتوں کا لباس پہننے یا ان کی مشابہت اختیار کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

لعن المتشبھات من النساء بالرجال والمتشبھین من الرجال بالنساء:
رسول اللہ صلعم نے ایسی عورتوں پر لعنت فرمائی ہے جو مردوں کی مشابہت اختیار کرتی ہوں۔ اور اسی طرح اُن مردوں پر بھی لعنت فرمائی ہے جو عورتوں کی مشابہت اختیار کرتے ہوں۔ [۲۷]

لعن النبی صلعم المخنثین من الرجال والمترجلات من النساء: رسول اللہ صلعم نے مخنث مردوں اور ان عورتوں پر لعنت فرمائی ہے جو خواہ مخواہ مرد بننے کی کوشش کرتی ہوں۔ [۲۸]

یہ چند حدود و ضوابط ہیں، جن کے ملاحظہ سے معلوم ہوسکتا ہے کہ اسلام کس قسم کے ضابطۂ اخلاق کی پابندی کرانا اور کس قسم کے معاشرے کی تعمیر کرنا چاہتا ہے۔ اس معاملے میں وہ کسی قسم کی ادنیٰ سے

---

[۲۵] ابوداؤد۔

[۲۶] مسند احمد ۸۵/۵۔

[۲۷] بخاری۔ ابوداؤد۔ ترمذی

[۲۸] بخاری: کتاب اللباس۔

ادنیٰ ڈھیل دینا بھی پسند نہیں کرتا، جس کی بنا پر معاشرے میں کوئی رخنہ یا شگاف پیدا ہو سکتا ہو، یا بدگمانیوں اور افواہوں کے پھیلنے کا موقع مل سکتا ہو۔ اس سلسلہ میں خود پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک واقعے سے کافی روشنی پڑتی ہے۔

ایک بار کا واقعہ ہے کہ رسول اللہ صلعم مسجدِ نبوی میں معتکف تھے۔ آپؐ کی زوجۂ محترمہ حضرت صفیہؓ آپ سے ملنے کے لئے مسجد تشریف لائیں۔ واپسی میں آپؐ انہیں اُن کے مکان تک چھوڑنے کے لئے تشریف لے جارہے تھے۔ غالباً رات کا وقت تھا۔ راستے میں دو شخصوں کا سامنا ہُوا تو وہ آپؐ کو سلام کر کے تیزی سے آگے بڑھ گئے۔ آپؐ نے انہیں آواز دے کر کہا کہ "ٹھہر جاؤ اور دیکھو کہ یہ میری بیوی صفیہ ہیں"۔ انہوں نے کہا کہ "سُبحان اللہ یا رسول اللہ!" اُن کا مطلب یہ تھا کہ ہم آپؐ کے بارے میں بھلا کیوں شک و شبہ میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ تو رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ "دیکھو شیطان تو خون کی طرح آدمی کے بدن میں دوڑتا رہتا ہے۔ لہٰذا مجھے خدشہ ہُوا کہ کہیں تمہارے دل میں کوئی خیال نہ گزرے"۔ [۲۹]

جب خود ہادیٔ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی احتیاط کا یہ عالم ہو، جن کے بارے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں ہے، تو پھر بھلا دوسروں کی کیا حقیقت ہو سکتی ہے۔

بہرحال مرد کے لئے عورت کے فتنے سے بڑھ کر دوسرا کوئی فتنہ نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس حقیقت کو رسولِ اکرم صلعم نے ایک علمی پیشین گوئی کے طور پر بیان فرمایا ہے۔

ما ترکت بعدی فی الناس فتنۃً أضر علی الرجال من النساء : میرے بعد لوگ جن فتنوں میں مبتلا ہوں گے ان میں مردوں پر سب سے زیادہ شدید فتنہ عورتوں کا ہوگا۔ [۳۰]

عورت اور تمدنی سرگرمیاں

یہ تھا صنفِ نازک پر چند اخلاقی اور معاشرتی پابندیوں کا تذکرہ۔ اب تمدنی و اجتماعی میدان کی طرف آئیے تو اس باب میں جیسا کہ اُوپر گزر چکا دستوری قوانین نہ ہونے کے برابر دکھائی دیتے ہیں۔

---

[۲۹] بخاری۔ ابواب الاعتکاف باب ۸۔

[۳۰] مسلم۔ ترمذی۔ ابنِ ماجہ

کیونکہ اجتماعی مسائل و معاملات کا دائرۂ کار مردوں ہی سے متعلق ہے۔ البتہ بعض شعبوں میں عورتوں کی شرکت یا اُن کے داخلے کے جواز کے بجائے صراحتاً عدمِ جواز ثابت ہوتا ہے مثلاً :

۱۔ اسلامی قانون کی رُو سے کوئی عورت نماز پڑھانے کے لئے مردوں کی امام نہیں بن سکتی۔ مردوں کی امامت کا فریضہ صرف مردوں ہی کے لئے مخصوص ہے۔ البتہ عورت بعض شرائط کے ساتھ مرد کی اقتداء میں نماز پڑھ سکتی ہے۔ جس کی تفصیل حدیث و فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے۔

۲۔ اسلامی نقطۂ نظر سے عورت کو کسی ملک کا سربراہ بنانا زوال و ادبار کی علامت ہوگا۔ کیونکہ رسول اللہ صلعم کو جب یہ خبر ملی کہ اہلِ فارس نے بنتِ کسریٰ کو اپنا سربراہِ مملکت بنا دیا ہے تو آپؐ نے فرمایا:

لن یُفلح قومٌ وَلّوْا أمرھم امراۃً : وہ قوم کبھی کامیاب نہیں ہوسکے گی جس نے اپنے (اجتماعی) معاملے کو کسی عورت کے حوالے کر دیا ہو۔ [۳۱]

اس میں اگرچہ کسی خاتون کو سربراہِ مملکت بنانے کی صریح ممانعت نہیں ہے، مگر یہ فعل اسلام کی نظر میں ناپسندیدہ ضرور ہے۔ کیونکہ اس میں قوم و ملک کے زوال کی صاف پیشین گوئی موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ قحط الرجال کی علامت ہے۔

۳۔ اسی طرح اسلامی قانون کی رُو سے عورت قاضی یا مجسٹریٹ نہیں بن سکتی۔ [۳۲]

فقہاء کے نزدیک یہ مسئلہ اگرچہ اختلافی ہے مگر اس کے نقصانات صاف ظاہر ہیں کہ عورت مطلوبہ شرائط پوری نہ کرسکنے کے باعث اس فریضہ کو صحیح طور پر ادا نہ کرسکے گی۔ اور عملاً دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اسلام میں شاید ہی کوئی عورت منصبِ قضا پر فائز ہوسکی ہو۔

یہ دینی دنیوی سیادت و قیادت کے تین اہم ترین شعبے ہیں، جن میں عورت کا کوئی حصہ نظر نہیں آتا۔ ان رہنما خطوط کی روشنی میں صاف دکھائی دیتا ہے کہ عورت کو کسی ایسے شعبے کا انچارج یا کسی کمیشن کا سربراہ بنانا درست نہ ہوگا جو اجتماعی نوعیت کا حامل ہو۔ جیسا کہ مذکورہ بالا حدیث کے الفاظ دلالت

---

[۳۱] بخاری: کتاب المغازی۔

[۳۲] نیل الاوطار: ۸/۲۴۰۔

کر رہے ہیں۔ " وَلَّوْا اَمْرَھُمْ اِمْرَأَةً " میں " اَمْرَھُمْ " کے الفاظ عام ہیں، یعنی اپنے کسی بھی اجتماعی معاملے کو عورت کے سپرد کرنا صحیح نہ ہوگا۔ کیونکہ عورت طبعاً ناقص العقل ہوتی ہے جس کی وجہ سے بسا اوقات معاملہ بگڑ سکتا ہے۔

نیز اس قسم کے اجتماعی معاملات میں خواتین کو دخل دینے سے روکنے کی دوسری وجہ بھی صاف ظاہر ہے کہ یہ مناصب طبقۂ نساء کے اصل دائرۂ کار سے باہر ہیں۔ اور تیسرے یہ کہ خواتین پر جو اخلاقی، تمدنی پابندیاں عائد کی گئی ہیں وہ خود بھی انہیں اس قسم کے اجتماعی امور و معاملات میں دخل دینے سے روکنے کے لئے کافی ہیں اور ان حدود و ضوابط کی وجہ سے وہ شرائط بھی پوری نہیں ہوتیں جو ان امور کو انجام دینے کے لئے ضروری ہیں۔ لہٰذا ان حدود و ضوابط کو عائد کرنے کا منشاء اسلام کی نظر میں شاید یہی ہے۔

یہ طبقۂ خواتین کی توہین یا اہانت نہیں بلکہ دراصل ان پر ان کی قدرت و طاقت سے بڑھ کر ایک زائد بوجھ ڈالنا ہے۔ عورت دراصل ان کاموں کے لئے تخلیق نہیں کی گئی ہے، جیساکہ خود اس کی ذہنی و جسمانی ساخت و پرداخت اس کی شہادت دے رہی ہے۔ بقول علامہ فرید وجدی اس سلسلے میں صنف نازک یا اس کے فرضی وکیلوں کو اگر کچھ شکوہ ہے تو یہ شکوہ مردوں سے نہیں بلکہ فطرت (اور خالقِ فطرت) سے کرنا چاہیئے۔

اب رہا معاملہ جہاد میں عورتوں کی شرکت کا، جس کی چند مثالیں ہمیں احادیث کی تصریحات کے مطابق دورِ رسالتؐ میں ملتی ہیں، تو یہ عورتوں کے لئے اذنِ عام یا اختیاری معاملہ نہیں تھا۔ بلکہ اس سلسلہ میں چند مخصوص اور غالباً تربیت یافتہ خواتین کو متعین کیا گیا تھا، جو اپنے شوہروں اور عزیزوں کے ساتھ جاتی تھیں اور زخمیوں کی مرہم پٹی اور مریضوں کی دیکھ بھال وغیرہ کرتی تھیں۔ اور غالباً یہ بات مردوں کی شدید کمی اور ایک اہم فوجی ضرورت کے تحت روا رکھی گئی تھی۔ اس کے برعکس ایسی عورتوں کو جو اپنے اختیار سے اور رضاکارانہ طور پر اس خدمت میں شریک ہونا چاہتی تھیں روکا گیا اور ان کی ہمت شکنی کی گئی۔ جیساکہ احادیث میں صراحت موجود ہے۔ چنانچہ بعض واقعات ملاحظہ ہوں۔

۱۔ کان رسول اللہ صلعم یغزو بام سلیم ونسوۃ معھا من الأنصار یسقین الماء ویداوین الجرحیٰ : رسول اللہ صلعم اُمّ سلیمؓ کو ساتھ لے کر غزوات کے لئے نکلا کرتے تھے۔ اور اُمّ سلیم کے ساتھ انصار کی چند عورتیں ہوتی تھیں جو جنگ میں پانی پلاتی تھیں اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں۔[۳۳]

اس حدیث کے الفاظ صاف دلالت کر رہے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ عادت تھی کہ آپ ہمیشہ یا اکثر وبیشتر جہاد کے لئے اُمّ سلیمؓ کو ساتھ لے کر نکلا کرتے تھے جو رشتے میں آپؐ کی پھوپی اور حضرت انسؓ کی والدہ تھیں اور دوسری حقیقت یہ ثابت ہو رہی ہے کہ صرف چند انصاری عورتیں اُمّ سلیم کے ساتھ ہُوا کرتی تھیں، جیسا کہ " ونسوة مَعَهَا " کے الفاظ دلالت کر رہے ہیں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہُوا کہ چند انصاری عورتیں ہمیشہ اُمّ سلیمؓ کی کمان میں ہُوا کرتی تھیں۔ گویا کہ آپ ان عورتوں کی کمانڈر تھیں۔ اور اغلب یہ ہے کہ یہ خواتین تربیت یافتہ رہی ہوں گی جن کو یہ تربیت دی گئی تھی کہ وہ اجنبی مردوں سے شرعی حدود وضوابط کو ملحوظ رکھتے ہُوئے کس طرح معاملہ کریں! ورنہ اس تخصیص کی کوئی دوسری وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ اسلامی جنگوں میں شریک ہو کر تیمارداری کرنے والی مُسلم خواتین کو موجودہ دور کی نرسوں پر قیاس نہ کیا جائے جو چُست اور نیم عریاں لباس پہنے ہُوئے اٹھلاتی پھرتی اور اپنی ننگی ٹانگوں کی نمائش کرتی نظر آتی ہیں۔

۲۔ اس کے برعکس جنگوں میں عورتوں کی عمومی شرکت کو ناپسند کیا گیا جیسا کہ غزوۂ خیبر کے ایک واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپؐ نے بغیر اجازت شریک ہونے والی چھ عورتوں کی ایک جماعت پر اپنے سخت غصے اور ناراضگی کا اظہار کرتے ہُوئے اُنہیں واپس بھیج دیا۔ نیز آپؐ نے ان عورتوں سے باز پرس کرتے ہُوئے پوچھا تھا کہ ــ " تم کس کی اجازت سے اور کس کے ساتھ آئی ہو؟ " ــ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جنگوں میں عورتوں کی شرکت پر سخت پابندیاں عائد تھیں۔[۳۴]

---

[۳۳] ترمذی۔

[۳۴] ملاحظہ ہو ابوداؤد۔

۳۔ اس کی تائید ان احادیث سے بھی ہوتی ہے جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کا جہاد اُن کے حج کرنے کو قرار دیا ہے۔ مثلاً حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ اُنھوں نے رسول اللہ صلعم سے جہاد میں شرکت کی اجازت چاہی تو آپؐ نے فرمایا کہ ــــ "تم عورتوں کا جہاد حج ہے" [۳۵]

۴۔ نیز حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی ایک روایت سے بھی اس کی مزید تائید ہوتی ہے جس میں مذکور ہے کہ ــــ "ہم جنگوں میں نبی کریم صلعم کے ساتھ شرکت کرتے تھے مگر ہمارے ساتھ عورتیں نہیں ہوتی تھیں۔ لہٰذا ہم مردوں نے آپؐ سے اپنے آپ کو خصّی کر لینے کی اجازت چاہی تو آپؐ نے ہمیں اس سے منع فرمایا" [۳۶]

عورت اور معاشی جدوجہد

ان تمام معروضات کے ملاحظے سے ظاہر ہوتا ہے کہ عورتوں کو عمومی حیثیت سے تمدنی ہنگامہ آرائیوں میں کودنے اور اجنبی مردوں کے شانہ بشانہ کام کرنے کی اسلامی ضوابط کی رُو سے قطعاً اجازت نہیں ہے۔ بلکہ اس قسم کے اقدامات مفسدِ تمدن و اجتماع ہوں گے۔ ہاں البتہ جیسا کہ عرض کیا جا چکا کسی کے شخصی و انفرادی حالات و مقتضیات کی رُو سے اور مجبوری کی صورت میں عورت کسبِ معاش کر سکتی ہے۔ مگر اس کے لئے اسلام کے ضابطۂ اخلاق کی مکمل پابندی ضروری ہوگی، جس کا تذکرہ اُوپر ہو چکا ہے۔

اسلام میں چونکہ عورت کی معاشی اور تمدنی جدوجہد کا براہِ راست کوئی حصہ نہیں ہے، اس وجہ سے ــــ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ــــ اس باب میں دستوری قوانین (یعنی قرآن و حدیث کے وہ واضح نُصوص جن پر قانون کی بنیاد رکھی جا سکتی ہو) موجود نہیں ہیں اور نہ حدیث و فقہ کی کتابوں میں ان کا مستقل حیثیت سے کوئی تذکرہ ملتا ہے، جب کہ حدیث کی کتابوں میں سیکڑوں ہزاروں عناوین کے تحت دیگر قوانین و ضوابط کا مفصّل تذکرہ موجود ہے۔ ہاں البتہ ابوداؤد میں ایک باب ملتا ہے جس کا عنوان ہے "باب فی کسب الاماء" یعنی لونڈیوں کے کسبِ معاش کے بارے میں۔ اس باب میں لونڈیوں کو چرخہ کاتنے اور روئی، اُون وغیرہ دُھننے وغیرہ کو جائز قرار دیا گیا ہے۔

۳۵؎ بخاری۔

۳۶؎ بخاری۔ مسند احمد۔

وَنَهَانَا عَنْ كَسْبِ الْأَمَةِ إِلَّا مَا عَمِلَتْ بِيَدِهَا، وَقَالَ هٰكَذَا بِأَصَابِعِهِ نَحْوَ الْخُبْزِ وَالْغَزْلِ وَالنَّقْشِ : اور رسول اللہ صلعم نے ہم کو لونڈی کی کمائی لینے سے منع فرمایا، سوائے اس کمائی کے جو وہ اپنا ہاتھ ہلا کر کرتی ہو۔ اور آپ نے انگلیوں سے اشارہ کیا، جیسے روٹی پکانا، سوت کاتنا اور روئی دھننا وغیرہ۔[۳۷]

ایک دوسری حدیث میں جو غزوۂ خیبر سے متعلق ہے اور جس میں مذکور ہے کہ چند عورتیں جنگ میں شرکت کرنا چاہ رہی تھیں۔ (یہ واقعہ اُوپر گزر چکا ہے) جب اُن سے اُن کے خروج کی وجہ دریافت کی گئی تو اُنہوں نے اپنا مقصد بیان کرتے ہُوئے یہ بھی کہا تھا کہ ۔"ہم اُون کاتیں گی اور اُس کے ذریعہ اللہ کی راہ میں مدد کریں گی"۔[۳۸]

ان دو حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عہدِ رسالت کے مدینے میں عورتوں میں چرخہ کاتنے کا رواج تھا اور شاید پارچہ بافی اور خیمہ دوزی کا بھی رواج رہا ہو، جو اس کا لازمہ ہے۔ بہرحال اس دَور میں عورتیں اپنے گھروں میں اس قسم کے ہلکے پھلکے کام کر لیا کرتی تھیں۔ مگر رسولِ اکرم صلعم نے انہیں اس سے منع نہیں فرمایا۔ بلکہ اجازت دی۔ لہٰذا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خواتین کو کسبِ معاش کی مطلق ممانعت نہیں ہے۔ بلکہ وہ اپنے گھریلو حالات اور تقاضوں کے مطابق فارغ اوقات میں کوئی بھی کام کر سکتی ہیں، جو ان کے مناسب حال ہو، خصوصاً دستکاریاں اور گھریلو صنعتیں وغیرہ۔

اور اس سلسلے میں خود دورِ رسالت میں ہمیں چند عملی مثالیں بھی ملتی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ عورت حسبِ ضرورت معاشی جدوجہد کر سکتی ہے یا اپنے شوہر کا ہاتھ بٹا سکتی ہے۔

بخاری کتاب النکاح میں مذکور ہے کہ حضرت اسماءؓ بنتِ ابوبکرؓ کا نکاح حضرت زبیر بن العوامؓ سے ہُوا تو وہ اُس موقع پر بہت تنگدست تھے اور ان کے پاس سوائے ایک اُونٹ اور ایک گھوڑے کے کچھ نہ تھا۔ لہٰذا حضرت اسماءؓ کو گھریلو کام کاج کے ساتھ باہر کا کام بھی کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ وہ اُونٹ اور

---

[۳۷] مسند احمد۔ ابوداؤد۔

[۳۸] ابوداؤد۔

گھوڑے کی دیکھ بھال کرتی تھیں۔ اور دو میل دُور جا کر ایک مقام سے گٹھلیاں چن کر لاتیں اور موصوفہ یہ سارا کام رضاکارانہ طور پر اپنی خوشی سے انجام دیتی تھیں۔ یہ حالت ایک عرصہ تک برقرار رہی، یہاں تک کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ایک غلام ان کے سپرد کر دیا۔ پھر اس کے بعد انہیں اس مصیبت سے نجات مل گئی۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی زوجۂ محترمہ زینب بنتِ ابو معاویہؓ ایک دستکار خاتون تھیں، جو دستکاری کر کے اپنے شوہر اور اولاد کی کفالت کرتی تھیں۔[۳۹]

اس طرح ذخیرۂ حدیث و سیرت کی چھان بین سے ہمیں اس سلسلے میں مزید واقعات بھی مل سکتے ہیں۔

اب رہا لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کا مسئلہ، تو یہ بھی اسی طرح ضروری ہے جس طرح کہ لڑکوں کی تعلیم و تربیت۔ اگر عورتیں جاہل رہیں گی تو پھر ظاہر ہے کہ وہ اپنے نونہالوں کی بھی صحیح تربیت نہیں کر سکیں گی۔ عورتوں کی دینی تعلیم بھی بہت ضروری ہے۔ کیونکہ دین سے بے گانگی کی بدولت بدعات و خرافات رواج پاتے ہیں۔ اور صحیح تعلیم کی بدولت عقائد و اعمال کی اصلاح کے ساتھ ساتھ اپنے فرائض و واجبات کی ادائیگی کا بھی شعور پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا لڑکیوں کی تعلیم نہایت ضروری ہے۔

اسلام نے عورتوں کو جو حقوق دئے اور ان کی اصلاح کے سلسلے میں جو تحریک بلند کی اس کا ایک بہترین نمونہ اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ ہیں جو ایک بہت بڑی عالمہ اور فقیہہ تھیں۔ حتیٰ کہ بڑے بڑے صحابہ تک آپ سے احادیث اور مسائلِ دین دریافت کرتے تھے۔

حرفِ آخر

یہ ہے عورت کے بارے میں اسلام کا صحیح، متوازن اور حقیقت پسندانہ موقف۔ آپ دنیا کے قدیم و جدید تمام قوانین کا جائزہ لیجئے، عورت کے بارے میں آپ کو ان سے بہتر اور منصفانہ قوانین نہیں ملیں گے، جو کسی معاشرے کی تعمیر کے لئے صالح بنیادوں کا درجہ رکھتے ہوں۔ ہر جگہ آپ کو

---

۳۹ سیر الصحابیات ص ۱۶۶

اُونچ نیچ اور افراط و تفریط نظر آئے گی، جس کے نتیجے میں خاندانوں کی تباہی و بربادی اور خاندانی مسرتوں کا خاتمہ نظر آتا ہے۔ اور انسانی ساختہ قوانین کا ہر جگہ یہی حال ہے۔ آج مغربی ممالک میں کثرتِ طلاق کی جو وبا پھوٹ پڑی ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ عورت معاشی حیثیت سے خود کفیل بن جانے کے بعد مرد کی دست نگر رہنا یا اس کی بالادستی کو قائم رکھنا پسند نہیں کرتی بلکہ آزادانہ زندگی گزارنے کو ترجیح دیتی ہے۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ خاندانی نظام ٹوٹ جاتا ہے، گھر جہنّم زار بن جاتے ہیں اور بے شمار پیچیدہ اور لاعلاج معاشرتی مسائل کھڑے ہو جاتے ہیں۔ عورت کی اس بے راہ روی پر خود دانشورانِ مغرب ماتم کر رہے ہیں۔ مگر تیر کمان سے نکل چکا ہے جس کو اب واپس لانا بہت مشکل دکھائی دیتا ہے۔

لہٰذا مشرقی ممالک کی عافیت اسی میں ہے کہ وہ خواہ مخواہ اور بلا سوچے سمجھے محض ظاہری چمک دمک کی بنا پر مغرب کی نقالی کرنے کی کوشش نہ کریں۔ مشرقی ممالک میں حالات ابھی قابو سے باہر نہیں ہُوئے ہیں۔ لہٰذا انہیں کوئی قدم اُٹھانے سے پہلے خوب اچھی طرح سوچ لینا چاہئے۔

حقیقت یہ ہے کہ عورت اور مرد کے تعلقات کے سلسلے میں صحیح حدود و ضوابط رکھنا خاندان اور معاشرے کی تعمیر و تشکیل کے لئے بہت ضروری ہے۔ اس باب میں ذرا سا بھی بے اعتدالی اور بے راہ روی کے باعث مسرت بخش زندگی کا خاتمہ ہو سکتا ہے اور عائلی نظام کی بنیادیں ہل سکتی ہیں جو تمام ابدی مسرّتوں کا مبدا و منبع ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک مضبوط معاشرے اور مضبوط ملک و قوم کی تاسیس کے لئے خاندانی و عائلی نظام کو مضبوط و مستحکم کرنا ضروری ہے کیونکہ خاندان ہی کسی ملک و معاشرے کی بنیادی اینٹ ہوتے ہیں۔ اگر وہ بکھر جائیں تو پھر پوری عمارت بھی تاش کے پتّوں کی طرح بکھر سکتی ہے۔

آخری بات یہ ہے کہ عورت یوں بھی جسمانی اعتبار سے مرد سے کمزور ہوتی ہے۔ مگر خصوصیت کے ساتھ حیض، حمل اور بچّے کی ولادت کے ایام میں اس کی کمزوری حد درجہ بڑھ جاتی ہے۔ ان اوقات میں اس کو آرام و راحت کی سخت ضرورت رہتی ہے۔ لہٰذا اس کی فطرت کا تقاضا ہے کہ اس کے ذمہ وہی کام سپرد کئے جائیں جن کو خود اس کی فطرت نے مناسب سمجھا ہو۔ اس کے برعکس اگر مردوں کے کام بھی عورتوں کے سپرد کر دئے جائیں تو یہ اس بسِ لطیف پر ایک زائد بوجھ بلکہ اس بیچاری پر ظلمِ عظیم ہوگا۔

بلکہ یہ درحقیقت مرد کی خود غرضی کی انتہا سمجھی جائے گی کہ وہ اس بیچاری سے اس کے گھریلو فرائض بھی ادا کرائے اور خود اپنے فرائض کی ادائیگی کے لئے بھی اسی کو مجبور کرے۔ یعنی معاشی جدوجہد کا بار بوجھ بھی اس پر ڈال دے اور خود کاہل یا عیاش بن کر تماشا دیکھا کرے! پھر جب پانی سر سے اُونچا ہو جائے تو اپنی بیوی کی بے وفائی کا شکوہ بھی کرے!!! یہ نہایت ہی عجیب اور غیر فطری واقعہ ہے جو خود کردہ را چہ علاج کا مصداق ہوگا۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ : یہ اللہ کے قائم کردہ حدود ہیں۔ سو تم ان سے باہر مت نکلو۔ اور جو لوگ اللہ کے حدود سے باہر نکل جاتے ہیں تو ایسے ہی لوگ اپنے حق میں ظالم ہوں گے۔ (بقرہ : ۲۲۹)

"یہ تو یقینی امر ہے کہ عورت معاشی حیثیت سے لاکھ آزاد ہو جائے مگر وہ کسی بھی صورت میں مرد کی حاکمیت سے باہر نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ دُنیا کی قدیم ترین تاریخ سے موجودہ دور تک کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا ہے جس میں عورتوں نے مردوں پر غلبہ پالیا ہو۔ یہ اس بات کا تاریخی ثبوت ہے کہ کارکنانِ قدرت نے عورت کی پیشانی پر سرنوشتِ اطاعت لکھ دیا ہے۔ کیونکہ ورڈ آف گاڈ کبھی ورک آف گاڈ سے مختلف نہیں ہو سکتا۔ یہ ہے الرجال قوامون علی النساء کا خُدائی فیصلہ جو کبھی نہیں بدل سکتا۔ اور جو بھی اس ابدی و سرمدی فیصلے کو بدلنے کی کوشش کرے گا اس کو مُنہ کی کھانی پڑے گی۔" [۴۰]

مَیں اپنے اس مقالے کو مولانا امین احسن اصلاحی کی کتاب کے ایک اقتباس پر ختم کرتا ہوں۔

> "ہم کو اس سے انکار نہیں ہے کہ روٹی ہوٹلوں میں بھی کھائی جا سکتی ہے۔ راتیں کلبوں اور سینما گھروں میں بھی گزاری جا سکتی ہیں۔ خبر گیری و تیمارداری ہسپتال اور نرسنگ ہوم میں بھی مل جاتی ہے۔ علیٰ ھذا القیاس یہ بھی ممکن ہے کہ انعامات اور تمغوں کا لالچ دلا کر (جیسا کہ روس میں کیا جاتا ہے) عورتوں سے بچے بھی جنوا لئے جایا کریں اور سرکاری پرورش گاہوں میں کرایہ کی نرسوں کے ذریعہ سے ان بچوں کی پرورش

---

[۴۰] ماخوذ از "مسلمان عورت"۔

بھی کرالی جایا کرے۔ لیکن اس کو خوب یاد رکھئے کہ ہوٹل میں جینے اور ہسپتال میں مرنے کی یہ زندگی نہ تو خاندان کی زندگی کا بدل ہو سکتی ہے اور نہ تنخواہ اور الاؤنس کی خاطر جنے ہوئے بچوں اور سرکاری پرورش گاہوں میں کرائے پر اُگائی نسلوں سے کوئی قوم بن سکتی ہے۔ آدمی سازی اور جوتا سازی کے کام میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ آپ جس طرح انعامات اور اُجرت کے بل پر کارخانوں میں جوتے تیار کرا سکتے ہیں، اگر وہی طریقہ آپ نے آدمی سازی کے لئے بھی اختیار کر لیا تو آدمیوں کی شکل کی ایک مخلوق تو ضرور تیار ہو جائے گی، لیکن وہ آدمیت کے تمام اوصاف سے یکسر خالی ہوگی۔ جو آدمی باٹا کے جوتوں کی طرح تیار کئے جائیں گے وہ پاؤں میں پامال کئے جانے کے لئے تو اچھے رہیں گے، لیکن زمین کی خلافت میں ان کا کوئی حصہ ہو، یہ ناممکن ہے۔[۴۱]

فہرستِ مراجع

۱۔ قرآن مجید

۲۔ صحیح بخاری، امام محمد بن اسماعیل بخاری، مطبوعہ استامبول

۳۔ صحیح مسلم، امام مسلم نیشاپوری، مطبوعہ ریاض

۴۔ سنن ابوداؤد، امام ابوداؤد سجستانی، مطبوعہ حمص

۵۔ سنن ترمذی، امام ابوعیسیٰ ترمذی، مطبوعہ کانپور

۶۔ سنن نسائی، امام نسائی، مطبوعہ دیوبند

۷۔ سنن ابن ماجہ، امام ابن ماجہ، مطبوعہ دیوبند

۸۔ مسند احمد، امام احمد بن حنبل، مطبوعہ بیروت

۹۔ مسلمان عورت، علامہ فرید وجدی، ترجمہ مولانا ابوالکلام آزاد، مطبوعہ دہلی

۱۰۔ پاکستانی عورت دوراہے پر، مولانا امین احسن اصلاحی، مطبوعہ لاہور

۱۱۔ سیر الصحابیات، مولانا سعید انصاری، مطبوعہ اعظم گڑھ

[۴۱] پاکستانی عورت دوراہے پر، ص ۱۵۹۔ ۱۶۰

تعدّدِ ازدواج

بعض غلط فہمیوں کا ازالہ

تعدّدِ ازدواج (کسی مرد کا ایک سے زیادہ شادی کرنے) کا تعلق منطقی اعتبار سے اگرچہ عورت سے متعلق نہیں ہے، کیونکہ اس کا تعلق زیادہ تر مردوں کے حقوق سے متعلق ہے۔ مگر موجودہ دور کے مفکّرین نے اسے خواہ مخواہ عورتوں کے حقوق سے اس طرح جوڑ دیا ہے کہ کسی مرد کا ایک سے زیادہ شادی کرنا لازمی طور پر عورتوں کے حقوق پر دست درازی بلکہ ان کی توہین کے مترادف ہے۔ حالانکہ بعض صورتوں میں تعدّدِ ازدواج عورتوں کی حق تلفی کے بجائے اُن کے ساتھ ایک بہت بڑا سماجی انصاف نظر آتا ہے، جیسا کہ تفصیل آگے آرہی ہے۔ مگر موجودہ دور میں ایک اچھی چیز کو بھی بُری بنا کر پیش کرنے کا فن کافی ترقی کر گیا ہے۔ چنانچہ آج "آزادیٔ نسواں" اور "حقوقِ نسواں" کے نام نہاد علمبردار عورت کی نام نہاد آزادی کے نام پر یہ کھیل کھیل رہے ہیں اور اُسے "آزادی" کا سبز باغ دکھا کر گھر سے "بے گھر" کر رہے ہیں تاکہ آزاد جنسی تعلقات کی راہ میں دین و اخلاق نے جو "پابندیاں" عائد کی ہیں اُن سے ہر قیمت پر چھٹکارا حاصل کر لیا جائے۔ اور اس راہ میں اُن کا سب سے بڑا نشانہ اسلامی تعلیمات کے مطابق پردہ، طلاق اور تعدّدِ ازدواج ہیں، جن پر وہ حملہ کر کے اس کے ذریعہ یک پنت دو کاج کے مطابق بیک وقت متعدد مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ یہ اسلامی اقدار اول تو تہذیبِ مغرب سے میل نہیں کھاتے بلکہ ان کی مخالفت کرتے ہیں اور دوسرے یہ کہ موجودہ ہندستانی "قومی دھارے" کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھے جاتے ہیں۔ اور تیسرے یہ کہ وہ آزاد جنسی تعلقات کی راہ میں بھی ایک سنگِ گراں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور چوتھے یہ کہ مسلم معاشرہ موجودہ گئے گزرے حالات میں بھی اخلاقی مفاسد سے (دیگر معاشروں کے مقابلے میں) بہت بڑی حد تک جو مامون و محفوظ ہے وہ غیروں کو بُری طرح کھٹک رہا ہے۔ لہٰذا وہ چاہتے ہیں کہ مسلم معاشرہ میں بھی دیگر

معاشروں کی طرح اخلاقی بُرائیاں عام ہوجائیں۔ لہٰذا وہ عورت کی "آزادی" اور اُس کے "حقوق" کے نام پر مختلف طریقوں سے مسلمانوں کو بہکاتے ہیں اور اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ نئے نئے فتنے پیدا کرکے مسلم معاشرہ میں انتشار برپا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہندستان میں یہ شرپسند تحریکیں نہایت منظم طریقے سے سرگرمِ عمل ہیں اور وقتاً فوقتاً ہاتھ پیر نکالتی رہتی ہیں۔ یہ سلسلہ اگرچہ بیسویں صدی کی ابتدا ہی سے جاری ہے، مگر آزادیٔ ہند کے بعد اس میں نہایت درجہ تیزی آگئی ہے۔ شاہ بانو کیس کے فیصل ہوجانے اور مسلم خواتین ایکٹ کے بن جانے کے بعد اگرچہ یہ تحریکیں وقتی طور پر ضرور دب گئی ہیں، مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ بالکل ہی ختم ہوگئی ہیں، بلکہ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ اندر ہی اندر نئے نئے منصوبے بن رہے ہیں اور آئندہ کے لئے نیا لائحۂ عمل ترتیب دیا جارہا ہے۔ لہٰذا اہلِ اسلام کو ہمیشہ چوکنا اور چوکس رہنے کی ضرورت ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ غفلت اور بے خبری میں پھر دوبارہ وہ مار کھاجائیں۔ لہٰذا انہیں ہر محاذ پر سرگرمی اور مستعدی دکھانی ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا موجودہ دور کا سب سے بڑا فتنہ یہ ہے کہ پروپگنڈہ کے زور پر کسی صحیح چیز کو غلط اور کسی غلط چیز کو صحیح قرار دیا جاتا ہے اور آج یہ فن اتنا ترقی کرگیا ہے اور اس قدر زوروں پر ہے کہ اس کی اثرانگیزی کے سامنے سچی بات بالکل مغلوب اور شکست خوردہ بن کر رہ جاتی ہے اور اُسے مدافعانہ موقف اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ چنانچہ آج پردہ، طلاق اور تعددِ ازدواج وغیرہ اسلامی اقدار (جو مسلم پرسنل لا سے تعلق رکھتے ہیں) کا یہی حال ہے، جن پر مخالفینِ اسلام نہایت شدت کے ساتھ چاندماری کرتے اور ان پر بے جا قسم کے اعتراضات کی بوچھار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ چیزیں پُرانے دور کی یادگار ہیں، جو عورت کے قیدی ہونے کی علامت ہیں اور ان کے ذریعہ حقوقِ نسواں پر آنچ آتی ہے۔ چنانچہ وہ مطالبہ کرتے ہیں کہ پردہ کے رواج کو ختم کیا جائے، تعددِ ازدواج کو ممنوع قرار دیا جائے اور طلاق پر پابندی عائد کی جائے۔ اور ان مطالبات کی تائید میں بعض مسلم نُما "دانشور" بے تکے پن کے ساتھ "اجتہاد" کی ہانک لگاتے ہوئے کہتے ہیں کہ اب چونکہ زمانہ بدل گیا ہے، اس لئے

ان "مسائل" میں نئے سرے سے اجتہاد کر کے انہیں موجودہ "ترقی یافتہ" قوانین سے ہم آہنگ کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ حالانکہ ایسے لوگ اجتہاد کی ابجد سے بھی واقف نہیں ہیں۔ کیونکہ اجتہاد اصلاً اُن مسائل میں کیا جاتا ہے جن کے تذکرہ سے قرآن اور حدیث خاموش ہوں۔ اس کے برعکس وہ احکام جو قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس سے ثابت ہوں ان پر بہر حال عمل کرنا واجب ہے۔ نیز یہ کہ قرآن اور حدیث کی تصریحات (نصوص) کے خلاف کوئی اجتہاد نہیں کیا جا سکتا۔

پردہ، تعددِ ازدواج اور طلاق وغیرہ (جن پر آج سب سے زیادہ اعتراض کیا جا رہا ہے) ایسی چیزیں نہیں ہیں جن سے عورتوں کی حق تلفی ہوتی ہو۔ بلکہ یہ موجودہ دور کے فتنوں کو دیکھتے ہُوئے عورت کے حقوق کی ضمانت ہیں۔ پردہ عورت کے قیدی ہونے کی علامت نہیں بلکہ اُس کے حفظِ ناموس کے لئے درحقیقت ایک ڈھال کی حیثیت رکھتا ہے۔ آج آپ کسی بھی شہر اور کسی بھی بھرے پُرے بازار اور شاہراہ سے گزریئے تو آپ دیکھیں گے کہ غنڈے اور اوباش لوگ پردہ دار یا برقع پوش خواتین سے کوئی تعرض نہیں کریں گے۔ بلکہ اس کے برعکس بے پردہ اور بن ٹھن کر گزرنے والی عورتوں سے چھیڑ چھاڑ کر کے ان کا ناک میں دم کر دیں گے۔ اگر کوئی چھیڑ چھاڑ نہ کرے تب بھی یہ بات کیا کم ہے کہ نامحرم لوگ ایسی عورتوں کو بھُوکی نظروں سے گھورتے رہتے ہیں جو تمام فتنوں کی جڑ ہے۔ اور حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو ہر قسم کے فساد کا باعث یہی بے پردگی اور آزادانہ میل جول نظر آئے گا۔ اسی وجہ سے اسلام نے عورت اور مرد کے آزادانہ میل جول اور بے پردگی پر روک لگائی ہے۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتا کہ عورت کی وجہ سے معاشرے میں کسی قسم کا فتنہ و فساد برپا ہو۔ لہٰذا اس قسم کے فتنے پیدا ہونے سے پہلے ہی ان پر روک لگانا ضروری ہے۔ ورنہ میل ملاپ کی آزادی کے بعد اس قسم کے فتنوں کو روکنا سخت مشکل ہوگا۔

طلاق عورت کے لئے کوئی ظالمانہ قانون نہیں بلکہ اکثر و بیشتر صورتوں میں یہ قانون عورت کی جان بچاتا ہے۔ چنانچہ جن معاشروں میں طلاق کا قانون موجود نہیں ہے یا اُس کا حصول نہایت مُشکل ہے اُن میں ناپسندیدہ عورتوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے انہیں زندہ جلا کر یا گلا گھونٹ کر مار دیا جاتا ہے، جیسا کہ اس کا رواج موجودہ ہندو سوسائٹی میں عام ہے۔ اور قرونِ وسطیٰ کے

مسیحی معاشروں میں جبکہ موجودہ دور کی طرح طلاق کی سہولتیں حاصل نہیں تھیں ایسی ناپسندیدہ عورتوں کو یا تو جادوگرنیاں ثابت کرکے چرچ سے انہیں سزائے موت دلوائی جاتی تھی یا پھر انہیں پانی میں ڈبوکر مار دیا جاتا تھا۔ اس اعتبار سے اسلام میں طلاق کی مشروعیت عورت کے لئے ظلم نہیں بلکہ رحمت اور اُن کی زندگی کی ضمانت ہے۔

اب رہا معاملہ تعدّدِ ازدواج (کسی مرد کا ایک سے زیادہ شادیاں کرنے) کا تو یہ ہر مرد کے لئے کوئی لازمی قانون نہیں بلکہ بعض تمدنی و سماجی حالات کے تحت ایک اجازت ہے۔ اور اس قسم کے قانون کی ایک زندہ مذہب و معاشرے میں بعض خصوصی سماجی حالات کے تحت شدید ضرورت رہتی ہے تاکہ معاشرے میں سُدھار لایا جائے اور اُسے اخلاقی مفاسد اور افراط و تفریط سے بچایا جائے، مثلاً :

۱۔ کبھی بیوی بانجھ ہوتی ہے یا اُس میں کوئی جنسی عیب ہوتا ہے، جس کی وجہ سے دوسری شادی کی ضرورت پڑتی ہے۔ کیونکہ مرد اور عورت کی ہمیشہ یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ صاحب اولاد ہوں جو اُن کے وارث اور جانشین بنیں نیز بڑھاپے میں اُن کی دیکھ بھال کریں۔

۲۔ عورت کے برعکس مرد ہمیشہ جنسی عمل کے لئے مُستعد رہتا ہے، جبکہ ہر عورت حیض، حمل اور نفاس کی وجہ سے جنسی عمل کے قابل نہیں رہتی۔ اور اس قسم کی مفارقت بعض مردوں پر شاق گزرتی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمام لوگوں کی طبیعتوں کو یکساں طور پر نہیں بنایا ہے۔ بعض لوگ اس قسم کی مفارقت برداشت کرسکتے ہیں اور بعض لوگ نہیں کرسکتے۔ لہٰذا فتنہ سے بچنے کے لئے ایسے لوگوں کو چند شرائط کے ساتھ دوسری شادی کی اجازت دی گئی ہے۔ مگر یہ چیز کسی بھی طرح عورت کے حقوق پر دست درازی نہیں بلکہ ایک حرام کام سے بچانے کے لئے ایک حلال طریقہ اختیار کرنا ہے۔ اور اس میں عورت اور مرد دونوں کے حقوق کی ضمانت ہے۔

۳۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی ملک یا معاشرے میں غیر شادی شدہ لڑکیوں کی لڑکوں کے مقابلے میں کثرت ہوتی ہے۔ اس صورت میں اگر فی مرد ایک عورت کے حساب سے نکاح ہو تو بہت سی

لڑکیاں غیر شادی شدہ رہ جاتی ہیں جو غلط راستوں پر نکل سکتی ہیں۔ لہٰذا اس فساد کو روکنے اور معاشرے کے توازن کو قائم رکھنے کے لئے بعض اوقات تعدّدِ ازدواج ضروری ہو جاتا ہے۔

۴۔ اسی طرح بیواؤں اور طلاق والی عورتوں کے مسائل کو حل کرنے کے لئے بھی تعدّدِ ازدواج ایک بہترین فارمولہ ہے۔ ورنہ معاشرے میں فساد برپا ہو سکتا ہے۔ خود پیغمبرِ اسلام صلعم نے جو زیادہ شادیاں کیں تو اس میں دیگر اسباب کے علاوہ ایک خصوصی سبب بیواؤں کی دیکھ بھال تھا، جن کا کوئی کفیل نہیں تھا۔ جیسا کہ خاص کر حضرت سودہ بنتِ زمعہؓ، حضرت زینب بنتِ خزیمہؓ اور حضرت اُمِ حبیبہ بنتِ ابوسفیانؓ وغیرہ کے حالات دلالت کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلعم کے اس فعل میں صرف مسلمانوں ہی کے لئے نہیں بلکہ سارے عالمِ انسانی کے لئے ایک بہترین نمونہ موجود ہے کہ وہ کسی جنسی خواہش یا دباؤ کے تحت نہیں بلکہ محض بیواؤں کی خبرگیری کے جذبے کے تحت ایک انسانی فرض سمجھ کر اس اُسوۂ رسول کی پیروی کریں۔ جبکہ حال یہ ہے کہ دنیا کی بعض قومیں (خاص کر ہندو قوم) بیواؤں اور مطلقہ عورتوں کو حد درجہ منحوس تصور کرتے ہوئے انہیں نفرت کی نگہ سے دیکھتی ہے جبکہ اس کے برعکس کوئی عورت مر جاتی ہے تو پھر شوہر کو منحوس تصور نہیں کیا جاتا۔ حالانکہ انسان ہونے کی حیثیت سے دونوں برابر ہیں۔ لہٰذا جب تک اس غلط تصور کو بدلا نہیں جاتا انسانی معاشرے کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔

آج دنیا میں بیواؤں اور مطلقہ عورتوں کی حالت حد درجہ ناگفتہ بہ ہے۔ خصوصاً ہندو مذہب میں بیواؤں کا حالِ زار ناقابلِ بیان ہے۔ شوہر کے انتقال کے بعد انہیں انسان ہی تصور نہیں کیا جاتا۔ بلکہ اُنہیں ہر قسم کے بنیادی حقوق سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ ایک ہندو بیوہ عورت کے سامنے دو ہی راستے رہتے ہیں: یا تو وہ شوہر کی چتا پر چڑھ کر ہنسی خوشی جل کر مر جائے (ستی ہو جائے) یا پھر کسی آشرم میں سسک سسک کر اور تڑپ تڑپ کر جان دے دے۔ لیکن اگر ہندو معاشرہ اسلامی قانون اور فارمولے پر عمل کرے تو اس قسم کے ظلم و ستم کا خاتمہ ہو سکتا ہے اور دُنیا چین و سکون کا سانس لے سکتی ہے۔ اسلام تو ہر قسم کی سماجی بُرائیوں کو مٹانے اور صحیح انسانی اقدار کو فروغ دینے کے لئے آیا ہے۔ لہٰذا تعدّدِ ازدواج ایک انسانی قانون ہے اور اس کو مٹانے کی کوشش کرنا ایک غیر انسانی حرکت ہے۔

۵۔ اس سلسلے میں سب سے بہتر حل یہ ہے کہ جو عورت بیوہ یا مطلقہ ہو جائے تو اُس کے قریبی اعزہ اور رشتہ دار محض انسانی جذبے کے تحت ایسی عورت کا ہاتھ تھام کر اس سے رشتۂ ازدواج میں (نکاحِ ثانی میں) منسلک ہو جائیں، جب کہ اُن کے معاشی حالات و وسائل اس کی اجازت دے رہے ہوں۔ اس سے ایک بیوہ کی خبرگیری صحیح طور پر ہو سکتی ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں حضرت زینب بنتِ جحشؓ اور حضرت حفصہ بنتِ عمر بن الخطابؓ سے رشتۂ ازدواج قائم کرنا اسی سلسلے کی مثالیں ہیں۔ اور سیرتِ رسولؐ کا یہ تابناک پہلو ہے کہ حضرت سودہ بنتِ زمعہؓ بوڑھی ہونے کی وجہ سے جنسی تعلق کے قابل نہیں تھیں، جن کی عمر ستر سال کی تھی، اور اسی بنا پر انہوں نے اپنی باری حضرت عائشہؓ کو سونپ دی تھی۔ مگر رسول اللہ صلعم نے انہیں محض ان کی خبرگیری کی وجہ سے اپنے حبالۂ عقد میں باقی رکھا۔

۶۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ جنگوں کی وجہ سے بہت سے مرد مارے جاتے ہیں اور عورتیں بیوہ ہو جاتی ہیں۔ ایسے ہنگامی حالات میں اگر کسی مرد کو ایک سے زیادہ شادی کرنے کی قانوناً اجازت نہ دی جائے تو پھر معاشرے میں جنسی فتنے اور خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ لہٰذا معاشرے کو جنسی انارکی سے بچانے کے لئے دستوری اعتبار سے ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کی اجازت ہونی چاہئے۔

۷۔ خلاقِ عالم نے جنسی خواہش مرد اور عورت میں یکساں طور پر نہیں رکھی ہے۔ بلکہ حیاتیاتی و طبی نقطۂ نظر سے یہ بات ثابت ہے کہ عورت کے مقابلے میں جنسی خواہش مرد میں زیادہ ہوتی ہے۔ اور پھر عورت حیض، حمل اور نفاس کی حالت میں جنسی عمل کے قابل نہیں رہتی۔ اور مرد عورت کے مقابلے میں اپنے نفس پر قابو نہیں رکھ سکتا۔ لہٰذا ایسی صورت میں ایک مرد کو ہر حالت میں ایک ہی بیوی کا پابند بنا کر رکھنا ناجائز تعلقات کا دروازہ کھولنا ہے۔ اور یہ انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ جب اُسے ایک جائز چیز سے روکا جائے تو وہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ناجائز طریقے استعمال کرنے لگتا ہے۔ چنانچہ آج مغربی معاشرے میں داشتاؤں MISTRESS یا زنانہ سکرٹریوں کی جو کثرت نظر آ رہی ہے اُس کی وجہ یہی ہے۔ اور یہ وبا اس حد تک پھیل گئی ہے کہ اس کی وجہ سے پورا معاشرہ زوال پذیر نظر آ رہا ہے اور حرامی بچوں سے یورپ اور امریکہ کی سڑکیں بھری ہوئی ہیں۔ اور اب یہی وبا مشرقی ممالک کو بھی اپنی لپیٹ میں

لے رہی ہے۔ لہٰذا اب اربابِ دانش کو فیصلہ کرنا چاہئے کہ نوعِ انسانی کی فلاح آیا تعددِ ازدواج میں ہے یا داشتائی نظام میں؟

غرض تعددِ ازدواج کے بہت سے اسباب و عوامل ہیں۔ جن میں سے چند بطورِ نمونہ اس موقع پر پیش کیے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اسلامی شریعت ایک آسمانی اور دائمی شریعت ہے جو نوعِ انسانی کی بھلائی اور اُس کے مفاد کے لئے نازل کی گئی ہے۔ لہٰذا اس میں جنسی انارکی اور اخلاقی فساد کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ بلکہ اُس کے تمام احکام حکمتوں اور مصلحتوں سے بھرپور ہوتے ہیں اور کوئی بھی چیز خلافِ عقل ثابت نہیں کی جا سکتی۔ لہٰذا ایسی انسان نواز اور عقل پرور شریعت یا اُس کے کسی ابدی حکم کو بدلنے کے مطالبہ کو سوائے اندھے تعصب کے اور کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔

اب رہا یہ مطالبہ کہ اگر کسی مرد کو ایک سے زیادہ بیویاں کرنے کا حق حاصل ہو تو پھر عورتوں کو بھی یہ حق حاصل ہونا چاہئے کہ وہ بھی بیک وقت ایک سے زیادہ مرد رکھیں، تو یہ ایک خلافِ عقل و خلافِ فطرت مطالبہ ہے۔ کیونکہ اس صورت میں نطفہ مخلوط ہونے کی وجہ سے بچے کے صحیح نسب کا پتہ نہیں چل سکتا۔ اور اس بنا پر بچے کا مستقبل خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ اور ایسی عورت زانیہ کے حکم میں آجاتی ہے۔ چنانچہ اُس میں اور ایک کسبی میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ کیونکہ اُس کا کوئی بھی "شوہر" اُس کی پوری طرح کفالت نہیں کر سکتا۔ نیز سب سے بڑی بات یہ کہ وہ اکثر و بیشتر ایک مرد ہی کا جنسی بوجھ برداشت کرنے سے کتراتی رہتی ہے تو پھر بہت سے مردوں کا بوجھ کس طرح برداشت کر سکتی ہے؟ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی خرابیاں ہیں۔ اور اس قسم کی خرابیاں ایک مرد کے ایک سے زیادہ بیویاں کرنے کی صورت میں پیدا نہیں ہو سکتیں۔ واقعہ یہ ہے کہ چند مرد مل کر ایک عورت کا بوجھ ہرگز نہیں اُٹھا سکتے۔ کیونکہ یہ خلافِ فطرت چیز ہے۔ اس کے برعکس ایک مرد چند عورتوں کا بوجھ اُٹھا سکتا ہے، جو ایک فطری امر ہے۔ اسی وجہ سے دُنیا کی کسی بھی شریعت نے عورت کو ایک سے زیادہ مرد کرنے کی اجازت نہیں دی۔ بلکہ اس قسم کے فعل کو ایک فحش کام اور زناکاری سے تعبیر کیا ہے۔ اسلامی شریعت نے طلاق کے بعد عورت کی عِدّت کو اسی بنا پر ضروری قرار دیا ہے کہ اگر اسے حمل ہو تو اُس دوران ظاہر ہو جائے اور نطفہ مخلوط نہ ہونے پائے۔ کیونکہ اس سے نسب مشتبہ ہو جاتا ہے۔

یہ تعدّدِ ازدواج کے اسباب و محرکات اور اسلام میں اس کی مشروعیت کی حکمت و مصلحت کا ایک سرسری جائزہ تھا۔ اور اس جائزہ سے ظاہر ہو گیا کہ ایک عالمی دین اور دائمی شریعت میں اس دفعہ اور صالح معاشرتی قانون کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ ورنہ اُس کی ابدیت و عالمگیری پر حرف آسکتا ہے۔ چونکہ عیسائیت میں اس قسم کا ابدی اور صالح معاشرتی قانون موجود نہیں ہے اور اس باب میں تورات (عہدنامۂ قدیم) کے جو قوانین موجود ہیں اُنہیں چرچ نے کالعدم قرار دے کر نہ صرف دین و اخلاق سے جہالت اور تنگ نظری کا مظاہرہ کیا ہے بلکہ عالمِ انسانی کو بھی طرح طرح کے عذاب میں مبتلا کر دیا ہے۔ اس لئے عیسائیت اب اپنے دین و شریعت کے ابدی و عالمگیر ہونے کا دعویٰ کبھی اور کسی صورت میں نہیں کر سکتی۔ کیونکہ معاشرتی اُمور میں اُس کے قوانین نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اور جو کچھ موجود ہیں اُن کی صُورت مسخ ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کی تفصیل میری کتاب "تعدّدِ ازدواج علم و عقل کی کسوٹی پر" میں ملے گی۔

عیسائی مذہب میں تعدّدِ ازدواج تو درکنار خود شادی بیاہ کرنا اور معاشرتی زندگی گزارنا بھی سخت معیوب اور ناپسندیدہ بات قرار دی گئی ہے، جس کا اثر مسیحی دنیا پر ایک ہزار سال تک قائم رہا۔ مگر اب مغربی دُنیا میں اباحیت پسندی اتنی عام ہو گئی ہے کہ مسیحیت کے سخت اور غیر فطری سارے بندھن ٹوٹ چکے ہیں اور موجودہ مغربی معاشرہ دوسرے انتہاء پر پہنچ گیا ہے۔ ایک طرف تفریط تھی تو دوسری طرف افراط ہے۔ اس طرح اب ایک اور خوفناک صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے۔ مصلحین حیران ہیں کہ ان خرابیوں کو کس طرح دُور کیا جائے؟ اور معاشرے کے موجودہ زوال و انحطاط کو کس طرح روکا جائے؟

یہ موجودہ دَور کا ایک لاینحل مسئلہ اور ایک معاشرتی ناسور ہے جو انسانیت کے بہی خواہوں کو پریشان کئے ہُوئے ہے۔ ایسے میں بجائے اس کے کہ ان خرابیوں کا حل تلاش کیا جاتا اور رخنوں کو بند کرنے کے لئے چارہ سازی کی جاتی، بعض لوگوں کا "مُصلحین" کا رُوپ دھار کر صحیح اور متوازن مذاہب پر حملہ کرنا اور ان کے صحیح و صالح قوانین کو بدلنے کا نعرہ بلند کرنا حد درجہ تعجب خیز ہے۔ مغرب کے موجودہ معاشرتی قوانین بگڑی ہُوئی عیسائیت کے ترجمان اور ایک زوال پذیر معاشرے کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس کے برعکس اسلام انسان کے صلاح و فلاح کا ضامن ہے اور اس کا کوئی بھی حُکم

خلافِ عقل اور خلافِ مصلحت ثابت نہیں کیا جاسکتا، جیساکہ اُوپر مذکور مباحث سے ظاہر ہوگیا۔ مگر مخالفینِ اسلام اسلامی شریعت کے احکام بدلنے کا مطالبہ اس لئے کرتے ہیں کہ جو خرابیاں آج مغربی معاشرے میں موجود ہیں وہ مسلم معاشروں میں بھی در آجائیں۔ تاکہ تالاب کی ساری مچھلیاں گندہ ہوجائیں۔ موجودہ گئے گزرے دور میں بھی اسلامی معاشروں میں عصمت و عفت کے جو تصورات پائے جاتے ہیں وہ بڑی حد تک اسلامی اقدار و تعلیمات ہی کا اثر ہے۔ اور یہی چیز مخالفین کے سینے پر سانپ بن کر لوٹ رہی ہے کہ جب ساری دُنیا جنسی مفاسد میں آلودہ اور مختلف قسم کی گندگیوں میں مبتلا ہے تو پھر مُسلم معاشرہ کیوں ان مفاسد سے محفوظ و مامون رہے؟ یہی وجہ ہے کہ وہ مختلف طریقوں سے "روشن خیالی" "عقلیت" "حقوقِ انسانی" "عورت سے انصاف" اور "مساوات" وغیرہ قسم کے نعرے لگا کر پُرفریب طریقے سے انہیں دھوکا دینے اور دینِ برحق سے برگشتہ کرنے کی دن رات کوشش کرتے رہتے ہیں اور اس نعرہ بازی میں بعض ابن الوقت قسم کے "مسلمان" بھی "علم و دانش" کا لبادہ اوڑھ کر حد درجہ چکنی چپڑی باتوں کے ذریعہ ان کی ہاں میں ہاں ملانے کے لئے ہمیشہ اور ہر جگہ تیار نظر آتے ہیں۔ چنانچہ طلاق اور تعددِ ازدواج کو ممنوع قرار دینے یا ان پر پابندیاں عائد کرنے کا مطالبہ ان دونوں طبقوں کی طرف سے یکساں طور پر کیا جاتا ہے۔

خلاصہ بحث یہ کہ تعددِ ازدواج کو ممنوع قرار دینے یا اس پر پابندی عائد کرنے کا مطالبہ کسی علمی وعقلی اور تمدنی ضرورت کے تحت نہیں بلکہ وہ محض سیاسی ذہن کی پیداوار ہے جو ایک تو اسلامی اقدارِ حیات سے تعصب کے اظہار کے طور پر ہے اور دوسرے یہ چیز نام نہاد "قومی وحدت" کی راہ میں ایک سنگِ گراں تصور کی جاتی ہے۔ اس موضوع پر تفصیلی بحث اور قانونِ ازدواج پر مذاہبِ عالم نیز مغربی دُنیا کے ایک بھرپور جائزہ کے لئے راقم سطور کی کتاب "تعددِ ازدواج: علم و عقل کی کسوٹی پر" دیکھنی چاہیئے۔

طلاقِ بائن اور طلاقِ مُغلّظہ کی حقیقت

اسلامی شریعت میں

اسلامی شریعت میں طلاق یعنی میاں بیوی کی جُدائی کو سخت ناپسند کیا گیا ہے اور صرف شدید ضرورت ہی کے وقت اس کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ تاکہ میاں بیوی کے تعلّقات جب انتہائی خراب ہو جائیں اور ان دونوں کے درمیان صُلح و صفائی کا کوئی موقع ہی باقی نہ رہ جائے تو پھر مزید خرابی سے بچنے کے لئے ان دونوں میں باعزت طور پر جُدائی عمل میں آجائے۔ معاشرتی نقطۂ نظر سے یہ ایک انتہائی ضروری اور منصفانہ قانون ہے جو عقلی اعتبار سے بھی ایک مفید اور اصلاحی اقدام ہے۔ مگر مغرب کے غلط پروپگنڈے سے متاثر ہو کر اس کو ایک "غیر ترقی یافتہ" قانون قرار دیا جاتا ہے اور اسلامی قانون کی بلا وجہ مذمت کی جاتی ہے۔ چنانچہ اسلام کے بعض "نئے وکیل" اس غلط پروپگنڈے سے متاثر ہو کر نہ صرف طلاق کو بجائے خود ایک بُرا فعل سمجھتے ہیں بلکہ "تین طلاقوں" کے ضابطہ کو قرآن اور حدیث کے خلاف علماء کی ایجاد قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس کا آغاز حضرت عمرؓ نے کیا تھا۔ لہٰذا اب وہ "اجتہاد" کے نام پر اس فیصلے کو بدل دینا چاہتے ہیں۔ اور ان نئے "مجتہدین" کے نزدیک "طلاقِ بائن" اور "طلاقِ مُغلّظہ" کا مفہوم بھی واضح نہیں ہے۔ بلکہ وہ ان دونوں کو ایک ہی چیز سمجھتے ہیں اور دونوں کو قرآنی تصوّر کے خلاف قرار دیتے ہُوئے طلاقِ مُغلّظہ کو ممنوع قرار دینے کا مطالبہ کرتے ہیں، جیسا کہ ایک سابق مرکزی وزیر عارف محمد خاں کا ادّعا تھا۔ اور ان لوگوں کے خیالات کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ فقہ اسلامی میں مذکور طلاق کے موجودہ قوانین قرآن اور سُنّت سے ہٹے ہوئے ہیں۔

۲۔ بیک وقت تین طلاق دینے کا طریقہ دورِ رسالتؐ اور دورِ ابوبکرؓ میں رائج نہیں تھا۔

۳۔ طلاقِ بائن غیر قرآنی طریقہ ہے جسے حضرت عمرؓ نے ایجاد کیا تھا۔

لہٰذا آئیے دیکھیں کہ اسلامی شریعت میں طلاق کا کیا مقام ہے اور طلاقِ بائن نیز طلاقِ مُغلّظہ کسے کہتے ہیں؟ اور اسلامی شریعت میں ان کی کیا حیثیت ہے؟ اصل میں یہ مسئلہ چند فقہی اصطلاحوں کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہُوا ہے۔ لہٰذا سب سے پہلے طلاق کی اصل حقیقت اور چند فقہی اصطلاحات کو سمجھ لینا بہت ضروری ہے۔

اسلام اور طلاق

اسلام میں طلاق نہایت ہی ناگزیر وجوہات کی بنا پر جائز قرار دی گئی ہے، جب کہ میاں بیوی میں کسی طرح نباہ ہی نہ ہوسکے اور ان دونوں کی جُدائی ضروری بن جائے۔ ظاہر ہے کہ انتہائی کشیدہ حالات میں بھی اگر ان دونوں کو کسی نہ کسی طرح "باندھ" کر رکھنے ہی کی کوشش کی جائے تو پھر ان کی زندگی بے کیف بلکہ اجیرن بن کر رہ جائے گی۔

چنانچہ فقہاء نے لکھا ہے کہ طلاق اُس وقت واجب ہوجاتی ہے جب انسان فرائضِ زوجیت کی ادائیگی سے عاجز ہو جائے۔ (کتاب الفقہ علی المذاہب الأربعۃ، ۲۹۶/۴، مطبوعہ بیروت)

اور طلاق کا اختیار صرف مرد کو دیا گیا ہے کہ وہ پوری سنجیدگی کے ساتھ اس پر ایک بار نہیں بلکہ ہزار بار سوچ لے کہ وہ کیا کرنے جارہا ہے۔ اسی بنا پر اسلام نے "طلاقِ رجعی" (لوٹانے والی طلاق) کی گنجائش رکھی ہے۔ یعنی ایک یا دو طلاق دے دینے کے بعد بھی بیوی کو لوٹالینے کی گنجائش باقی رہے۔ اور یہ مذاہبِ عالم میں صرف اسلام ہی کی خصوصیت ہے کہ طلاق دے چُکنے کے بعد بھی رُجوع کرنے کا حق باقی رہتا ہے۔ موجودہ معاشرتی مسائل اور پیچیدگیاں اسلامی قوانین کو نہ جاننے کی وجہ سے پیدا ہو رہی ہیں، جس کی وجہ سے اسلام اور علماء کو ناحق بدنام کیا جارہا ہے۔ آج کل کے مسلمانوں کو علماء کی یاد محض نکاح یا نمازِ جنازہ پڑھوانے کے وقت ہی آتی ہے۔ اگر طلاق دینے سے پہلے بھی لوگ علماء سے رجوع کرکے صُلح وصفائی کرانے یا طلاق دینے کا صحیح طریقہ معلوم کرنے کی کوشش کریں تو پھر اس قسم کے خوفناک نتائج بالکل ہی نہ نکلیں۔ مگر افسوس اس بات کا ہے کہ لوگ علماء کے پاس طلاق دینے سے پہلے مشورہ طلب کرنے کے لئے نہیں آتے بلکہ تین

طلاق دے کر فتویٰ طلب کرنے آتے ہیں - اور پھر ایک کڑوے سچ کا مقابلہ کرتے ہیں۔

جواز کے اعتبار سے طلاق کی تین قسمیں

تو سب سے پہلے معلوم ہونا چاہئے کہ طلاق کے جائز اور ناجائز ہونے کے اعتبار سے اس کی تین قسمیں ہیں: (۱) طلاقِ اَحسن (۲) طلاقِ حَسَن اور (۳) طلاقِ بدعی۔

طلاقِ اَحسن یہ ہے کہ مرد اپنی منکوحہ بیوی کو ایسے طُہر (عورت کی پاکی کی حالت) میں صرف ایک طلاقِ رَجعی (لوٹانے والی) دے جس میں اُس سے مُجامعت نہ کی ہو۔ اور پھر اُس کو اُسی حالت میں چھوڑ دے یہاں تک کہ اُس کی عدت گزر جائے۔

طلاقِ حَسَن یہ ہے کہ مدخولہ عورت (جس سے نکاح کے بعد جماع کیا جا چکا ہو) کو تین طُہروں میں تین طلاقیں (متفرق طور پر) دے۔ یعنی ہر طُہر میں مُجامعت کیئے بغیر ایک ایک طلاق دے۔

اور طلاقِ بدعت یہ ہے کہ عورت کو دو یا تین طلاق بیک لفظ یا ایک ہی طُہر میں، یا اُس طُہر میں جس میں عورت سے مجامعت کر چکا ہو، یا حیض کی حالت میں طلاق دے ڈالے۔ (ہدایہ و عالمگیری)

ان میں سے پہلی دو قسمیں جائز اور تیسری قسم ناجائز ہے۔ (بعض فقہاء کے نزدیک حرام اور بعض کے نزدیک مکروہ)۔

اب اس موقع پر دو حیثیتوں سے کلام کرنا ہے: اول یہ کہ ان تینوں قسم کی طلاق کا حُکم اُن کے وقوع کی حیثیت سے کیا ہے؟ یعنی عدّت گزر جانے کے بعد عورت اور مرد کی حیثیت کیا رہے گی؟ اور دوم یہ کہ بیک وقت دی گئی یا ایک ہی طُہر میں دی گئی تین طلاقوں کا حُکم کیا ہے؟ آیا ان کا وقوع کتاب وسُنّت اور اجماع و قیاس سے ثابت ہوتا ہے یا نہیں؟

وقوع کے اعتبار سے طلاق کی تین قسمیں

تو پہلے سوال کا جواب حاصل کرنے کے لئے طلاق کی مزید تین قسموں کا جاننا ضروری ہے جو طلاق کے وقوع کے بعد طلاق کے اثرات اور اُس کے نتائج کو ظاہر کرتی ہیں: (۱) طلاقِ رَجعی (۲) طلاقِ بائن، یا بائنہ صُغریٰ (۳) اور طلاقِ مُغلّظہ، یا بائنہ کُبریٰ۔

طلاقِ رجعی : وہ طلاق ہے جس کے بعد عِدّت کے اندر عورت کو لَوٹا لینے کا اختیار باقی رہتا ہے۔ اور یہ اختیار ایک یا دو طلاقوں تک ہے۔

طلاقِ بائن (بائنہ صُغریٰ) : اگر عورت کو ایک یا دو طلاق رجعی دے کر عِدّت کے اندر اُس سے رجوع نہیں کیا تو عدّت گزرنے کے بعد وہ عورت "بائن" (یعنی جُدا) ہو جاتی ہے۔ مگر ایسی عورت سے پھر باہمی رضامندی اور نئے مہر کے ساتھ دوبارہ نکاح ہو سکتا ہے۔ اسی وجہ سے اس کو "بائنہ صُغریٰ" (چھوٹی جُدائی والی) کہا جاتا ہے۔

طلاقِ مُغلّظہ (سخت طلاق) : وہ ہے جس میں تین طلاقیں تین طُہروں میں متواتر دے دی جائیں۔ یا ایک ہی طُہر میں تین یا ایک ہی لفظ میں تین طلاقیں دے دی جائیں۔ ایسی عورت اُس مرد پر فوری طور پر اُس وقت تک حرام ہو جاتی ہے، جب تک کہ وہ عدت گزار کر کسی دوسرے مرد سے نکاح کر کے اُس کے ساتھ مُجامعت نہ کر لے اور وہ پھر کسی وجہ سے اُس دوسرے مرد سے بھی طلاق حاصل کر کے دوبارہ عدّت نہ گزار لے۔ اسی وجہ سے اس کو "بائنہ کُبریٰ" (بڑائی جدائی والی) کہا جاتا ہے۔ یہ دراصل مرد کے لئے ایک سزا ہے کہ بیوی کو طلاق دینا کافی سوچ بچار کے بعد ہونا چاہئے تھا، جس میں اُس نے عجلت کیوں کی اور اس قدر سخت رویہ کیوں اختیار کیا ؟ ایسی صورت میں جب کہ شریعت نے اُس کے لئے آسان طریقہ بھی تجویز کیا تھا (کہ وہ ایک یا دو طلاقیں دے کر بیوی کو چھوڑ دے تاکہ اُس کو بعد میں ندامت یا پریشانی نہ ہو)۔ مگر قانون میں اتنی گنجائش ہونے کے باوجود خود اُس نے یہ انتہائی اور مُہیب شکل اختیار کی ہے تو اب اُس کو اس کے لازمی اور تلخ نتائج بھگتنے ہی پڑیں گے۔

اس بحث سے اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ عورت کا بائن یا مُغلّظہ ہونے کا تعلق بیک وقت دی گئی تین طلاق والے مسئلے ہی سے نہیں ہے بلکہ سُنّت طریقے کے مُطابق تین طہروں میں الگ الگ دی ہُوئی تین طلاقوں کی وجہ سے بھی طلاقِ مغلظہ واقع ہو سکتی ہے۔ جبکہ بائنہ (اور اس سے مُراد عموماً صغریٰ ہوتی ہے) ایک یا دو طلاقوں کی وجہ سے ہوتی ہے جبکہ عدّت گزر جائے۔

طلاقِ بائن اور طلاقِ مغلظہ قرآن میں

غرض طلاقِ بائن اور طلاقِ مغلظ دونوں قرآن مجید کی سورۂ بقرہ آیت نمبر ۲۲۹ اور ۲۳۰ کی رُو سے ثابت ہوتی ہیں جو یہ ہیں :

اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ...... (۲۲۹)
فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ، فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ (۲۳۰)

ترجمہ : طلاق دو مرتبہ ہے ۔ پھر یا تو بھلائی کے ساتھ روک لینا ہے یا نیکی کے ساتھ چھوڑ دینا ہے .... پھر اگر وہ شخص (اپنی) عورت کو طلاق دے دے تو وہ اُس کے بعد اس کے لئے حلال نہ رہے گی، یہاں تک کہ وہ کسی دوسرے خاوند سے نکاح کرلے، پھر اگر وہ اسے طلاق دے دے تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ آپس میں رجوع کرلیں جب کہ اُن کا گمان غالب ہو کہ وہ اللہ کی حدیں قائم رکھ سکیں گے ۔

پہلی آیت یہ ظاہر کر رہی ہے کہ طلاق میں رُجوع کا حق صرف دو بار تک ہے ۔ پھر اس کے بعد " فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ " کے مطابق عدت کے اندر لوٹا لینا ہے یا پھر " اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ " کے مطابق عورت کو حُسنِ سلوک کے ساتھ چھوڑ دینا ہے ۔ مفسّرین اس فقرے کی دو طرح سے تفسیریں کرتے ہیں : (۱) یا تو تیسری طلاق دئے بغیر یونہیں چھوڑ دے (۲) یا تیسری طلاق دے کر چھوڑ دے ۔ پہلے قول کے مطابق اگر صرف ایک یا دو طلاقوں کے بعد چھوڑ دیا تو ایسی عورت " بائنہ صُغریٰ " کہلائے گی، جس سے عدت کے بعد باہمی رضامندی سے نئے مہر کے ساتھ پھر دوبارہ نکاح ہو سکتا ہے ۔ یہ ایک فقہی اصطلاح ہے جو قرآن اور حدیث کے مفہوم و منشا کی وضاحت کرنے کے لئے وضع کی گئی ہے ۔ لہٰذا اس قسم کی اصطلاحوں کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ بذاتِ خود قرآن اور حدیث میں بھی انہی الفاظ کے ساتھ ملیں گی ۔

طلاقِ مغلظہ کا حکم

پہلی آیت میں جب طلاقِ رجعی کا حکم اور اُس کی تعداد بتادی گئی کہ صرف دو تک ہی رجوع کرنے کا حق باقی رہتا ہے تو پھر اس کے بعد دوسری آیت میں بتایا گیا کہ تین طلاق یا تیسری بار طلاق دینے کے کیا اثرات مرتب ہوں گے ؟ پس " فَاِنْ طَلَّقَهَا " میں یہی بتایا گیا ہے کہ تیسری بار طلاق دینے کے بعد عورت اُس پر اُس وقت تک حرام رہے گی جب تک کہ وہ دوسرا شوہر نہ کرلے۔ واضح رہے کہ قبل کے فقرہ " اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ " سے مُراد اگر تیسری بار طلاق مراد ہو تو پھر " فان طلقها " ایک مزید چوتھی طلاق نہیں بلکہ صرف تیسری طلاق کی مزید وضاحت اور اس کی شرعی حیثیت واضح کرنا ہے، جیساکہ مفسّرین نے تصریح کی ہے۔ پھر اس آیت میں جہاں پر " فان طلقها " دوسری بار استعمال ہُوا ہے اس سے مُراد دوسرا شوہر ہے۔ مطلب یہ کہ جب دوسرا شوہر طلاق دے دے تو بعد عدت وہ پہلے شوہر کے لئے دوبارہ نکاح کے ذریعہ حلال ہوسکتی ہے۔

طلاقِ مغلّظہ کو ممنوع قرار دینا قرآن کو بدلنا ہے

یہ قرآنِ مجید کا صریح اور قطعی فیصلہ ہے جو " بنصِ صریح " ثابت ہے اور اس میں سلف سے لے کر خلف تک دو رائیں نہیں ہیں۔ اسی کو فقہا اپنی اصطلاح میں " طلاقِ مغلّظہ " یا طلاقِ بائنہ کُبریٰ کہتے ہیں، جس کو اسلام کے بعض " نئے وکیل " ممنوع قرار دینے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ کیا اس کا مطلب قرآن یا فرمانِ خداوندی کو تبدیل کر دینا نہیں ہے ؟ یہ ایک الگ بحث ہے کہ کوئی شخص فرمانِ خداوندی کو بدل دینے کا مطالبہ کرنے کے بعد مسلمان رہتا بھی ہے یا نہیں۔ مگر اس موقع پر قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ طلاق کی جس قسم کو علماء اور فقہاء کی ایجاد بتایا جارہا ہے کیا واقعۃً بات ایسی ہی ہے ؟ فقہا کا " جرم " اس قدر ہے کہ انہوں نے احکامِ قرآن کی تنقیح کی، اُس کے مسائل کا استنباط کیا اور اُس کے مفہوم و منشا کو واضح کرنے کے لئے چند اصطلاحات (TERMS) وضع کئے تاکہ لوگ منشائے خداوندی کو خوب اچھی طرح سمجھ لیں۔ مگر اُلٹے در پردہ ان پاکباز ہستیوں پر طرح طرح کے الزامات عائد کرنا یا تو اپنی جہالت کا مظاہرہ کرنا ہے یا پھر الحاد و تشکیک کو ہوا دینا۔ جس کو

سوائے اسلام دشمنی کے اور کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ غرض اس موقع پر آپ بجائے "طلاقِ مغلّظہ" کے کوئی دوسری اصطلاح استعمال کریجیے، قرآنی مفہوم و منشا میں کوئی فرق نہیں پڑ سکتا۔ کیونکہ تین طلاقوں کے بعد ایسی عورت حرام ہو جاتی ہے۔

کیا تین طلاقیں علما کی ایجاد ہیں؟

اب رہا مسئلہ بیک وقت تین طلاق دینے کا، تو اس سلسلے میں خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ جمہور فقہا اس کے جواز کے قائل نہیں، بلکہ بیک وقت یا ایک مجلس میں تین طلاق دینے کو بہت بڑا گناہ قرار دیتے ہیں۔ اور اس قسم کی طلاق کو سوائے امام شافعی کے تمام فقہا "طلاقِ بدعت" کہتے ہیں، جس کی تعریف اُوپر گزر چکی ہے۔ لیکن اب سوال یہ ہے کہ اگر کوئی اس بدعت یا حرام کا ارتکاب کر ہی بیٹھے تو اس کا کیا حکم ہے؟ تو اس بارے میں قرآن، حدیث، اجماعِ صحابہ، اجماعِ فقہائے اربعہ اور قیاس کے پیش نظر تین طلاقوں کے نفاذ اور وقوع کا فیصلہ کرنا ہی پڑتا ہے۔ اور سوائے بعض ظاہرین کے چودہ سو سال سے یہ پوری ملتِ اسلامیہ کا متفقہ فیصلہ ہے۔ چنانچہ بیک وقت دی گئی تین طلاقوں کے وقوع کے ثبوت پر قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس کے متفقہ دلائل پر مشتمل ایک مفصل مضمون ایک الگ کتاب کی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔

اس بحث سے بخوبی ظاہر ہو گیا کہ بیک لفظ یا ایک مجلس میں تین طلاق دینا علما کے نزدیک پسندیدہ ہرگز نہیں ہے۔ اور پھر حضرت عمرؓ یا علما پر اس کی ایجاد کا الزام تو سراسر ایک بہتان اور تاریخ و حدیث سے ناواقفیت کا ثبوت ہے۔ اصل مسئلہ صرف اس کے وقوع کا ہے کہ آیا ایسی بیک وقت دی ہوئی طلاقیں واقع ہوتی ہیں یا نہیں؟ یہ الگ بحث ہے کہ کوئی شخص جان بوجھ کر تین طلاقیں دیتا ہے یا جہالت کی وجہ سے! تو جمہور اُمت کا مسلک یہی ہے کہ ایسی طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں۔ مگر اس کو علما کی ایجاد بتانا ایک ایسا افسانہ ہے جس کا اختراع "فقیہانِ برخود غلط" ہی کر سکتے ہیں۔

خلاصۂ بحث یہ کہ بیک وقت تین طلاق دینا شرعاً ناجائز ہے اور جمہور علماء اس کی مذمّت کرتے ہیں۔ مگر وہ ناجائز یا حرام ہونے کے باوجود قانونی اعتبار سے نافذ ہو جاتی ہیں۔ یہ دو الگ الگ

مسائل ہیں اور اسی میں لوگوں کو اشتباہ ہو جاتا ہے یا پیدا کر دیا جاتا ہے۔ تین طلاقوں کے وقوع اور نفاذ پر قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس سب متفق ہیں کہ بیک وقت یا ایک ہی مجلس میں دی ہوئی تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں، اگرچہ ایسا کرنا سخت گناہ اور شدید ناراضگی کا باعث ہے۔ چنانچہ حنفی مسلک کی مشہور کتاب ہدایہ میں مذکور ہے: وَطَلَاقُ الْبِدْعَةِ اَنْ یُطَلِّقَهَا ثَلَاثاً بِکَلِمَةٍ وَاحِدَةٍ اَوْثَلَاثاً فِیْ طُهْرٍ وَاحِدٍ، فَاِذَا فَعَلَ ذٰلِکَ وَقَعَ الطَّلَاقُ وَکَانَ عَاصِیاً: اور طلاقِ بدعت یہ ہے کہ منکوحہ کو ایک لفظ میں تین طلاق یا ایک طُہر میں تین طلاق دی جائے۔ جب کوئی ایسا کرے گا تو طلاق تو واقع ہو جائے گی مگر وہ گنہگار ہوگا۔ (ہدایہ اولین، ص ۳۳۵)

اور فتاویٰ عالمگیری میں اس کی مزید تفصیل اس طرح ملتی ہے: طلاق بدعت دو قسم کی ہے۔ ایک عدد والی اور دوسری وقت والی۔ عدد والی طلاقِ بدعت یہ ہے کہ ایک ہی طُہر میں عورت کو تین طلاق دے دے، خواہ وہ بیک لفظ ہو یا متفرق طور پر، یا ایک ہی طُہر میں دو طلاقیں جمع کر دے، خواہ ایک ہی کلمہ سے ہو یا متفرق طور پر۔ پس ایسا کیا تو یہ طلاقِ بدعی واقع ہو جائے گی مگر طلاق دینے والا گنہگار ہوگا۔ اور وقت والی طلاقِ بدعت یہ ہے کہ مدخولہ عورت جس کو حیض آتا ہے اُس کو حالتِ حیض میں یا ایسے طُہر میں جس میں اُس سے جماع کیا ہے طلاق دی۔ تو یہ بھی بدعت ہے۔ مگر طلاق واقع ہو جائے گی۔ مگر مرد کے لئے مُستحب یہ ہے کہ اس سے رجوع کر لے۔ بلکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ ایسی صورت میں رجوع کرنا مرد پر واجب ہے۔ (فتاویٰ عالمگیری، کتاب الطلاق)

جمہور فقہاء کا بھی یہی مسلک ہے کہ بیک وقت تین طلاق دینا ناجائز اور حرام ہے مگر اس کے باوجود وہ قانوناً نافذ ہو جاتی ہیں۔ مگر اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ علماء و فقہاء نے تین طلاقوں کو جائز قرار دیا ہے خواہ مخواہ کج بحثی کرنا بلکہ ایک بہتان تراشی ہے۔ اور اس کا مقصد کوئی علمی خدمت نہیں بلکہ محض عوام کو علماء کی طرف سے بدظن کر کے اسلامی شریعت کے بارے میں شبہات پیدا کرنا اور الحاد کا دروازہ کھولنا ہے۔

قرآن اور حدیث کی صراحتوں کے خلاف اجتہاد باطل ہے

الغرض بیک وقت یا ایک مجلس میں تین طلاقیں دینا ایک ناپسندیدہ اور غیر مسنون طریقہ ہے۔ مگر اس کے باوجود یہ فعل لغو یا باطل نہیں ہو سکتا، بلکہ اپنے منطقی نتائج رکھتا ہے۔ کیونکہ کسی ممنوع فعل کے ارتکاب سے وہ فعل کالعدم نہیں ہوتا۔ تین طلاق کے وقوع پر قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس چاروں متفق اللفظ ہیں اور اس پر چودہ سو سال سے برابر عمل درآمد ہو رہا ہے۔ لہٰذا اب اس کو حضرت عمرؓ یا علماء کی ایجاد قرار دے کر اسے "اجتہاد" کے نام پر بدلنے کا نعرہ بلند کرنا ایک شرانگیز تحریک ہے۔ کیونکہ یہ تحریک قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس (شریعت کے چار بنیادی ماخذوں) کے خلاف ہے۔ اور اصول یہ ہے کہ جب کوئی شرعی حکم قرآن اور حدیث کے "نصوص" (واضح بیانات و مدلولات) سے ثابت ہو جائے تو اس پر عمل کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ کیونکہ قرآن اور حدیث کے ثابت شدہ نصوص کے خلاف اجتہاد کرنا باطل ہے۔ اور ایسے اجتہاد کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ اور پھر یہاں پر تین طلاقوں کے وقوع پر نہ صرف قرآن اور حدیث متفق ہیں بلکہ صحابہ کرام کے دور میں اس پر اجماع بھی ہو چکا ہے اور وہ موافقِ قیاس بھی ہے۔ لہٰذا اب اس فیصلے کے خلاف کوئی نیا فیصلہ کرنا اسلامی شریعت کو بدلنے کا مطالبہ کرنا ہے۔

نوٹ: تین طلاق کے مسئلے پر تفصیلی بحث نیز قرآن اور حدیث کے دلائل کے لئے راقم سطور کی نئی کتاب "تین طلاق کا ثبوت: اسلامی شریعت میں" دیکھنی چاہیئے۔

عورت اور آزادانہ سیر و سیاحت
ایک آیتِ قرآنی پر بحث

لفظ سیاحت و رہبانیت کی تحقیق : قرآن، حدیث اور کلام عرب کی روشنی میں۔
تکمیلِ دین کا انوکھا روپ اور اسلام کا حیرت انگیز کارنامہ

تمہید

۱۹۸۳ء میں دہلی میں ایک سیمنار "عورت اور اسلام" کے موضوع پر منعقد ہوا، جس میں رامپور کے ایک صاحب نے "عورت اور تعلیم" کے عنوان سے ایک انتہائی قابلِ اعتراض مقالہ پیش کیا، جس میں عورتوں اور مردوں کے درمیان کامل مساوات، عورتوں کی بے پردگی، عورتوں کو ہر قسم کا علم حاصل کرنے اور دُنیا کی سیر و سیاحت آزادانہ طور پر کرنے اور ملکی و انتظامی معاملات میں حصہ لینے کے جواز کا دعویٰ کرتے ہوئے بعض قرآنی آیات سے غلط استدلال کیا تھا۔ اور بڑی جسارت و دیدہ دلیری کے ساتھ بعض من مانے دعوے کئے تھے اور بعض قرآنی آیات کو توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہوئے علماء اور مفسّرین کو خواہ مخواہ مطعون کرنے کی کوشش کی تھی۔

اس سیمنار میں راقم سطور بھی ایک مقالہ نگار کی حیثیت سے شریک تھا۔ لہٰذا جب میں نے دورانِ سیمنار موصوف کے دعووں کو چیلنج کرتے ہوئے اس سلسلے میں ائمہ لغت کی تحقیقات پیش کیں تو وہ بغلیں جھانکنے لگے اور برسرِعام کہہ دیا کہ میں اپنی تحریر واپس لیتا ہوں۔ یہ ہے آجکل کے "محققین" اور "روشن فکر" طبقے کی علمیت کا حال جو اپنے "علم" کے ساتھ دو چار قدم بھی چلنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ بلکہ علمِ صحیح کے مقابلے میں فوراً ہی ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔

قُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ : کہہ دو کہ حق آیا اور باطل مٹ گیا۔ (بنی اسرائیل: ۸۱)

اور ان لوگوں کا مقصد محض ناواقف لوگوں کو دھوکا دینا اور عوام کو علماء سے بدظن کرنا ہوتا ہے۔ تاکہ وہ دین کو بیچ کر تھوڑا سا دنیوی نفع حاصل کرسکیں۔ اور ایسے لوگ "علمیت" اور "مولویت" کا نقاب اوڑھ کر عوام کے سامنے آتے ہیں تاکہ وہ لوگوں کو دین سے برگشتہ کرسکیں۔

غرض راقم سطور موصوف کے غلط اور بے سروپا دعووں کا جب پوسٹ مارٹم کرنے بیٹھا تو محض اُن کے ایک دعوے کے جواب میں ایک اچھا خاصا علمی مضمون تیار ہوگیا، جو ایک قرآنی آیت کی غلط تشریح و تفسیر سے متعلق ہے۔ اور وہ اس وقت ہدیۂ ناظرین کیا جارہا ہے۔

چند بنیادی اُصول

بحث کا آغاز کرنے سے پہلے چند بنیادی اُصول و مبادی کا تذکرہ کردینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ پہلی بات یہ ہے کہ علمی دُنیا میں اختلافِ رائے ایک فطری واقعہ ہے اور یہ حقیقت دینی و دنیوی تمام علوم و فنون میں موجود ہے۔ حتیٰ کہ خالص شرعی و فقہی اُمور بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ اگر اختلافِ رائے نہ ہوتا تو پھر فقہ اسلامی کے وہ مشہور مذاہب بھی وجود میں نہ آتے، جن پر قرونِ وسطیٰ سے لے کر آج تک برابر عمل ہو رہا ہے۔ مگر یہ اختلافِ رائے قرآن اور حدیث کے واضح دلائل اور دیگر صحیح اُصولوں کی بنیاد پر ہے، جن پر "علم اُصولِ فقہ" میں بحث کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ فقہی مذاہب (حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی) باہم مختلف ہونے کے باوجود ایک دوسرے کو گمراہ اور بددیانت نہیں سمجھتے۔ کیونکہ یہ اختلافات نفسانی خواہشات کی بنیاد پر نہیں بلکہ ہر ایک کے پاس نظری و علمی حیثیت سے معقول دلائل موجود ہیں۔ یہ دراصل اسلامی شریعت کی وسعت و ہمہ گیری ہے تاکہ وہ اسلام کی ابدیت و عالمگیری کے تقاضوں کی رُو سے تمام جغرافیائی خطہ ہائے ارض کے مطابق ثابت ہوسکیں، جیسا کہ محققین کی رائے ہے۔

اس لحاظ سے مجرد اختلافِ رائے کوئی غلط بات یا قابلِ اعتراض چیز نہیں ہے۔ مگر ہاں جیسا کہ عرض کیا جاچکا اختلافِ رائے صحیح اصولوں کی بنیاد پر اور مدلل ہونا چاہیے۔ خصوصاً جب کہ معاملہ دین و شریعت کا بھی ہو۔ کیونکہ ہماری کسی بھی غلط حرکت اور غلط اقدام کا اثر نہ صرف معاشرے پر بُرا پڑتا ہے بلکہ یہ اقدام دینِ الٰہی کی تحریف اور خلقِ خُدا کو گمراہ کرنے کا بھی باعث ہوتا ہے، جو خُدا کے نزدیک

بہت بڑا گناہ اور باعثِ عذاب ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اختلافِ رائے اور بحث و مباحثہ انتہائی متانت اور شائستگی کے ساتھ ہونا چاہئے۔ کسی پر شخصی حملہ یا سبّ وشتم کرنا جائز نہیں ہے۔ اس سلسلے میں یہ زرّیں اُصول پیش نظر رہنا چاہئے کہ علمی بنیادوں پر کسی پر تنقید کرنا تو بالکل جائز ہے مگر اُس کی تنقیص کرنا جائز نہیں۔ یعنی کسی پر تنقید بالکل علمی ہو شخصی نہ ہو۔ غیر ضروری سب وشتم اہلِ علم کا شیوہ نہیں ہو سکتا۔

تیسری بات یہ ہے کہ جس علم یا فن پر گفتگو کی جارہی ہو اُس کے مالہ و ماعلیہ — یعنی اس کے تمام متعلقات — کا مطالعہ کر لینا چاہئے۔ ظاہر ہے کہ کسی فن پر گفتگو کرنے سے پہلے اس فن کی تحصیل اور اس کا مطالعہ ضروری ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے قرآن پر گفتگو کرنے سے پہلے قرآن اور عربی زبان کا صحیح علم حاصل کر لینا چاہئے۔ پھر اگر قرآن کے شرعی احکام و اوامر پر گفتگو ہو تو اس کے لئے "اُصولِ فقہ" کا مطالعہ بھی ضروری ہو جاتا ہے جس میں یہ بحث کی جاتی ہے کہ قرآن اور حدیث سے احکام و مسائل کا استنباط کرنے کے اُصول و آداب کیا ہیں؛ ان تمام علوم پر حاوی ہونے کے بعد زبان کھولنا چاہئے۔ آخر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ کوئی شخص اگر کسی فن میں مہارت نہیں رکھتا تو پھر اس فن کے مسائل میں فتویٰ دینے بیٹھ جائے! ایسا تو دنیا کے کسی بھی علم و فن میں نہیں ہوتا۔ تو پھر لوگ کتاب اللہ ہی پر کیوں اپنی طبع آزمائی کرتے ہیں؟ کیا اللہ کا کلام اتنا سستا ہو گیا ہے کہ اس کے بارے میں گفتگو کرنے کے لئے کسی بھی علم کی تحصیل یا کسی بھی فن میں مہارت کی کوئی ضرورت نہیں ہے؟ کیا کوئی شخص ڈاکٹری یا علمِ طب کی تحصیل کے بغیر ڈاکٹری کر سکتا ہے؟ نیز کیا کوئی شخص علمِ سائنس حاصل کئے بغیر مسائلِ سائنس پر بحث کرنے اور ان میں رائے دینے کا مجاز ہو سکتا ہے؟ وقس علی ذلك۔

لہٰذا ضروری ہے کہ جس علم و فن پر گفتگو کی جائے پہلے اس کا صحیح علم حاصل کر لیا جائے۔ خصوصاً کتاب اللہ میں کسی قسم کا توڑ مروڑ یا غلط استنباط بالکل جائز نہیں ہے۔ ورنہ بصورتِ دیگر وہ خود بھی گمراہ ہوگا اور دوسروں کو بھی گمراہ کرے گا۔ جیسا کہ مشہور مقولہ ہے: "نیم حکیم خطرۂ جان، نیم ملّا خطرۂ ایمان"۔ چنانچہ ایک حدیث میں بغیر علمِ صحیح کے محض اپنی رائے کی بنیاد پر کتاب اللہ کی تفسیر کرنے کی سخت

وعید آئی ہے:

من قال فی القران برأیہ فلیتبوأ مقعدہ من النار : جس نے قرآن میں (بغیر علم کے) اپنی رائے سے کچھ کہا تو اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے[۱] ایک دوسری حدیث میں " برأیہ " کی جگہ پر " بغیر علم " بھی آیا ہے[۲]

چوتھی بات یہ ہے کہ علم ایک مقدس امانت ہے، اس میں کسی قسم کا دھوکہ اور مکر و فریب نہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ عالم کی تعریف ایک حدیث میں یہ بتائی گئی ہے کہ وہ دنیا میں اللہ کا امین ہوتا ہے[۳] اسی طرح علم میں کسی دنیوی غرض کی خاطر کسی قسم کی تلبیس و تحریف بھی نہ ہونی چاہیئے۔ ورنہ وہ نہ صرف علم کے ساتھ بلکہ پوری قوم و ملت کے ساتھ بھی خیانت و بدخواہی ہوگی، جس کی کسی ایماندار آدمی سے توقع نہیں کی جاسکتی۔ اس قسم کی بدعہدیاں یہود و نصاریٰ کا شیوہ تھیں۔ کیونکہ وہ دنیوی اغراض و مقاصد کی خاطر اللہ کے بعض احکام چھپا دیتے تھے اور آیاتِ الٰہی میں تلبیس و تحریف سے کام لیتے تھے۔ چنانچہ اس قسم کی کسی بھی تلبیس و تحریف کا ارتکاب کرنے والوں کو سخت وعید سناتے ہوئے فرمایا گیا:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ : یقیناً وہ لوگ جو ان کھلی کھلی باتوں اور ہدایت کو چھپا دیتے ہیں جن کو ہم نے اُتارا ہے، اس کے بعد بھی کہ ہم نے ان باتوں کو لوگوں کے لئے (اپنی اس) کتاب میں وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے، تو یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ لعنت کرتا ہے اور (دوسرے) لعنت کرنے والے بھی لعنت کرتے ہیں۔ (بقرہ : ۱۵۹)

اور دوسری جگہ کہا گیا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۚ

---

[۱] و [۲] جامع ترمذی، أبواب تفسیر القرآن، باب ما جاء فی الذی یفسر القرآن برأیہ، ج ۴ ص ۲۶۸، مطبوعہ بیروت۔

[۳] العالم أمین اللہ فی الأرض۔ (کنز العمال : ۱۰/۷۷، طبع ثانی، ۱۳۸۲ھ)

وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ : یقیناً جو لوگ اللہ کی اُتاری ہُوئی کتاب کو چھپاتے ہیں اور اس کے عوض میں تھوڑا سا مول لیتے ہیں تو یہ لوگ اپنے پیٹوں میں صرف آگ بھرتے ہیں، اللہ ان سے قیامت کے دن کلام نہیں کرے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا (بلکہ) ان کے لئے دردناک قسم کا عذاب ہوگا۔ (بقرہ: ۱۷۴)

اسی بنا پر حدیث میں کہا گیا ہے :

انما أخاف علی اُمتی الأئمة المضلّین : میں اپنی اُمّت کے بارے میں صرف گمراہ قسم کے قائدین سے ڈرتا ہُوں ؎

زیرِ بحث مسئلہ

اس تمہید کے بعد اصل مسئلہ کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ان مومنین کی تعریف کرتے ہوئے جو اس کی راہ میں جدوجہد کرتے ہُوئے شہید ہوجاتے ہیں، اُن کی چند صفات اس طرح گنائی ہیں :

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ : بےشک (مومن مجاہد وہ لوگ ہیں جو) توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، شکر بجالانے والے، روزہ رکھنے والے، رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، اچھے کاموں کا حکم کرنے والے، بُری باتوں سے روکنے والے ہیں۔ اور ایسے ایمان والوں کو خوشخبری سنا دو۔ (توبہ : ۱۱۲)

اس آیتِ کریمہ سے ماقبل فرمایا گیا ہے : اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کی جانوں کو جنّت کے عوض میں خرید لیا ہے، جو اس کی راہ میں لڑتے ہیں۔ پس قتل بھی کرتے ہیں اور شہید بھی ہوتے ہیں۔ یہ تورات، انجیل اور قرآن میں سچا وعدہ ہے جس کا پورا کرنا ضروری ہے، اور اللہ سے زیادہ وعدہ پورا کرنے والا کون ہے۔ سو جو سودا تُم نے کیا ہے اُس سے خوش رہو، اور یہ بڑی کامیابی ہے۔ (توبہ : ۱۱۱)

؎ ابو داؤد، کتاب الفتن، حدیث نمبر ۴۲۵۲ ج ۴ ص ۴۵۰ مطبوعہ حمص، نیز ترمذی، أبواب الفتن، باب ماجاء فی أئمة المضلین، ۳/۳۴۲، نیز سنن دارمی، مقدمہ، باب ۲۳، ۱/۷۰، نیز مسند أحمد : ۵/۲۷۸، بیروت۔

ان دونوں آیتوں کا ماحصل یہ ہے کہ اہلِ ایمان کی پوری زندگی ایمان کے تقاضے کے مطابق احکامِ الٰہی کے تابع ہوتی ہے۔ جب وہ اللہ کی راہ میں جدوجہد کرتے ہوئے شہید ہوجاتے ہیں تو سیدھے جنت میں چلے جاتے ہیں۔ اور اگر زندہ رہتے ہیں تو اُن کی زندگی اُن صفات کے مطابق ہوتی ہے جو اُوپر گنائی گئی ہیں۔

اس طرح رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خانگی زندگی سے متعلق ایک آیتِ کریمہ آئی ہے جس میں ازواجِ مطہرات کو مخاطب کرتے ہوئے نیک سیرت بیویوں کی تعریف و توصیف اس طرح کی گئی ہے:

عَسٰی رَبُّہٗۤ اِنْ طَلَّقَکُنَّ اَنْ یُّبْدِلَہٗۤ اَزْوَاجًا خَیْرًا مِّنْکُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَیِّبٰتٍ وَّ اَبْکَارًا: اگر نبی تمہیں طلاق دے دے تو بہت جلد اس کا رب اس کے بدلے میں تم سے اچھی بیویاں عطا کرے گا، جو اطاعت گزار، ایمان والیاں، فرمانبردار، توبہ کرنے والیاں، عبادت گذار، روزہ دار، بیوائیں اور کنواریاں ہوں گی۔ (تحریم: ۵)

اس آیتِ کریمہ کا ماحصل جیساکہ اس کے سیاق و سباق نیز کتبِ تفسیر و حدیث سے ظاہر ہوتا ہے یہ ہے کہ ازواجِ مطہرات کے ایک خانگی واقعے کی بنا پر جس میں بعض ازواج کے درمیان رشک و رقابت کا معاملہ پیدا ہوگیا تھا، بعض ازواجِ مطہرات کے اس خیال کی تردید کی گئی ہے کہ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں طلاق دے دی تو آپ کو ہم سے بہتر بیویاں نہیں ملیں گی۔

اس حیثیت سے یہ آیتِ کریمہ نہ صرف ازواجِ مطہرات کو نیک سیرتی پر اُبھار رہی ہے بلکہ ایک آئیڈیل مسلم عورت کی توصیف بھی کر رہی ہے کہ ایک صحیح اور سچی اللہ کی بندی کی صفات کیا ہونی چاہئے اور اُس کی زندگی کیوں کر گزرنی چاہئے۔

اس طرح سورۂ توبہ اور سورۂ تحریم کی ان آیات میں فرمانبردار مردوں اور فرمانبردار عورتوں کا تذکرہ بطور ایک مثالی نمونہ اور آئیڈیل ہے۔

اب ان دونوں آیتوں میں موضوعِ بحث الفاظ "السائحون" اور "السائحات" ہے۔ مفسّرین کے نزدیک ان دونوں الفاظ کے اصل معنی روزہ رکھنے والوں کے ہیں، جیساکہ اُوپر ترجمہ

کیا گیا ہے، مگر اس کے دیگر ثانوی معنی بھی آتے ہیں، جیسا کہ تفصیلی بحث اگلے صفحات میں مذکور ہے۔

اب دیکھئے مضمون نگار نے ان دونوں آیات کے متعلق ایک غلط اور بے سرو پا دعویٰ کر کے ان آیات کے اصل مفہوم کو بگاڑنے اور محض اپنی ذہنی اُپج کے ذریعے بعض نئے خیالات سے ان کو ہم آہنگ کرنے کی کس طرح کوشش کی ہے! چنانچہ مضمون نگار کا دعویٰ یہ ہے کہ "السائحون" کے معنی صرف "سیر و سیاحت کرنے والوں" کے ہیں۔ اور اُردو کے جن مترجمین نے اس کا ترجمہ "روزہ رکھنے والے" کیا ہے وہ کتاب اللہ میں تحریف کرنے والے اور بے بنیاد نظریات قائم کر کے دیدہ و دانستہ معنی بدلنے والے ہیں۔ ان کی نظر میں مولانا ابوالکلام آزاد ہی وہ واحد مترجم ہیں جنہوں نے اس سلسلے میں دیانت داری کا مظاہرہ کیا ہے۔ (تفصیل آگے آئے گی) پھر اس کے بعد یہ فتویٰ لگا دیا ہے کہ "سائحات" سے مراد چونکہ سیر و سیاحت کرنے والی عورتیں ہی ہیں، اس لئے عورتوں کو بھی مردوں ہی کی طرح سیر و سیاحت کرنے اور آزادانہ تعلیم حاصل کرنے کا حق حاصل ہے۔

یہ مضمون نگار کی محض ایک ذہنی اُپج ہے کہ اول تو اس سے ایک ایسا حکم نکال رہے ہیں جو صحیح تفسیر و روایات کے تحت ثابت نہیں ہوتا اور پھر اس کو ایک دوسرے معاملے سے متعلق بھی کر رہے ہیں۔ یعنی آزادانہ حصولِ تعلیم، جس کا نہ تو ان آیات سے کسی قسم کا تعلق ہے اور نہ کوئی جوڑ۔

پھر فرماتے ہیں کہ "آپ عربی کی تمام لغات چھان ماریئے آپ کو سیاحت کے معنی روزہ رکھنا نہ ملے گا"۔

بہت خوب! اسی کو کہتے ہیں: چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد!

ان الفاظ کی لغوی تحقیق تو ابھی آپ کے سامنے آئے گی اور ڈھول کا پول کھل جائے گا لیکن پہلے آپ مذکورۂ بالا آیات میں معنوی اعتبار سے غور کیجئے کہ موصوف نے جو مفہوم بیان کیا ہے اور اس سے جو نتیجہ نکالا ہے وہ خود ان آیات پر کہاں تک چسپاں ہو سکتا ہے؟ اور راقم سطور نے آیاتِ بالا کی جو تشریح و تفسیر اُن کے سیاق و سباق کے تحت کی ہے کیا اُس کی روشنی میں اس قسم کا کوئی نتیجہ نکل بھی سکتا ہے؟ کیا رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات کو اس طرح آزادانہ سیر و سیاحت کرنے اور

آزادانہ تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دی گئی تھی؟ کیا انھوں نے یا ان میں سے کسی ایک نے بھی اس طرح کی کوئی مثال قائم کی ہے؟ کیا حدیث و سیر اور تاریخ کی کتابیں اس قسم کی کوئی مثال پیش کر سکتی ہیں؟ ذرا غور فرمائیے یہاں پر تذکرہ عام مسلمان عورتوں کا نہیں بلکہ صرف ازواجِ مطہرات کا ہو رہا ہے۔ لہٰذا اس آیت کریمہ سے عام مسلمان عورتوں کے لئے ایسا مخصوص حکم ثابت کرنا جس کا کوئی نمونہ یا عملی مثال ازواجِ مطہرات ـــــ رضی اللہ تعالیٰ عنھن ـــــ نے نہ پیش کیا ہو ایک غلط اُصول ہے۔ اس حیثیت سے ازواجِ مطہرات کی زندگیاں بھی مسلمان عورتوں کے لئے مشعلِ ہدایت ہیں۔ نہ کہ اُن کی مُبارک سیرتوں سے انحراف کر کے آزادروی اور آزادانہ میل جول اختیار کرنا۔ (واضح رہے کہ مضمون نگار مسلمان عورت کے لئے کسی بھی قسم کے پردے کے قائل نہیں ہیں۔)

واضح رہے کہ راقم سطور عورتوں کی تعلیم کا مخالف نہیں ہے۔ بلکہ عورتوں کو اسلامی ضوابطِ اخلاق کی پابندی کرتے ہُوئے تعلیم حاصل کرنا جائز و مباح ہے، خصوصاً دینی تعلیم۔ جیسا کہ ازواجِ مطہرات کی سیرتیں اس باب میں بھی ہماری رہنمائی و رہبری کے لئے کافی و شافی ہیں۔ خصوصاً سیرتِ حضرت عائشہ صدیقہؓ۔ چنانچہ آپ عورتوں میں اپنے دور کی سب سے بڑی عالمہ اور فقیہہ تھیں۔ حتیٰ کہ بڑے بڑے صحابہ تک آپ سے فتویٰ طلب کرتے تھے۔ چنانچہ صحاح ستہ وغیرہ میں آپ سے ۲۲۱۰ حدیثیں مروی ہیں، جن پر دین و شریعت کا بہت بڑا مدار ہے۔ اور "بعض لوگوں کا قول ہے کہ احکامِ شرعیہ میں سے ایک چوتھائی ان سے منقول ہے۔" [۵]

اسی طرح سورۂ توبہ کی آیات میں جہاں پر مومنین و مجاہدین کی صفات بیان کرتے ہُوئے جس طرح اُن کی تعریف و توصیف کی گئی ہے اس میں بھی آزادانہ سیر و سیاحت یا تفریح وغیرہ کا کوئی موقع و محل نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ اس موقع پر کسی قسم کی تفریح یا سیر و سپاٹے کی تعریف نہیں کی جا رہی ہے۔ اگرچہ تفریح کرنا یا سیر و سیاحت کرنا کوئی ناجائز فعل یا قابلِ مذمت حرکت نہیں ہے مگر اس کو اس آیتِ کریمہ کے ذیل میں نہیں لایا جا سکتا۔

---

۵ سیر الصحابیات، از مولانا سعید انصاری، ص ۳۰، طبع پنجم، ۱۹۷۲ء۔

ائمہ لغت کی تحقیق

اب آیئے ان دونوں الفاظ (سائحون اور سائحات) کے بارے میں سب سے پہلے مستند ائمہ لغت کی تحقیق کو دیکھیں کہ وہ ان کے بارے میں کیا کہتے ہیں ؟ چنانچہ "لسان العرب" عربی زبان کی سب سے بڑی اور سب سے مفصل لغت ہے۔ اس کے مؤلف علامہ ابنِ منظور تحریر فرماتے ہیں :

لفظ " سَیْحٌ "[1] کے اصل معنی بہنے والے پانی کے ہیں۔ (السیح : الماء الظاهر الجاری علی وجه الأرض)۔ اور " ماءٌ سَیْحٌ " بہتے ہوئے پانی کو کہتے ہیں۔

اسی سے لفظ سیاحت بھی ہے، جس کے معنی عبادت و ریاضت کی خاطر زمین میں چلنے کے ہیں۔ (والسیاحة الذهاب فی الأرض للعبادة والترهب)۔ اور مطلق چلنے کو بھی سیاحت کہا جاتا ہے۔ (وساح فی الأرض یسیح سیاحةً أی ذهب)۔[2]

دیکھئے یہاں پر سیاحت کے اولین معنی عبادت و ریاضت کی خاطر زمین میں نقل و حرکت کے قرار دئے گئے ہیں جو اُردو والوں کے لئے شاید ایک بالکل ہی نیا اور چونکا دینے والا مفہوم ہے اور پھر یہ بھی ملاحظہ فرمایئے کہ موصوف نے اس مفہوم کو مطلق چلنے پر مقدم رکھا ہے۔

اب آیئے سائحون اور سائحات کی طرف، تو اس سلسلے میں صاحب لسان العرب مشہور ائمہ لغت و نحو کے اقوال سے استدلال کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ " سیاحت " کے معنی روزہ رکھنے کے بھی ہیں :

وقوله تعالیٰ : الحامدون السائحون ؛ وقال تعالیٰ : سائحات ثیّبات و أبكاراً ؛ السائحون والسائحات : الصائمون۔ قال الزجّاج : السائحون فی قول أهل التفسیر واللغة جمیعاً الصائمون۔

یعنی سائحون اور سائحات سے مراد ہیں روزہ رکھنے والے اور روزہ رکھنے والیاں۔ زجاج نے

---

[1] اسی سے سائحون اور سائحات مشتق ہے۔ عربی زبان کے قواعد کے مطابق ان سب کا اصل مادہ (ROOT) " س ی ح " ہے۔
[2] لسان العرب، ۲/۴۹۲، طبع جدید، دار صادر بیروت۔

کہا ہے کہ تمام اہلِ لغت وتفسیر کے نزدیک اس سے مُراد روزہ رکھنے والے ہیں۔

ملاحظہ فرمائیے زجاج کوئی ملّا یا مولوی نہیں بلکہ لغت ونحو کے مشہور امام ہیں جو بصرے میں چوتھی صدی ہجری میں گزرے ہیں۔

پھر صاحبِ لسان تحریر کرتے ہیں: ومذهب الحسن أنهم يصومون الفرض: اور حسن بصری کے مسلک کے مطابق یہ وہ لوگ ہیں جو فرض روزے رکھتے ہیں۔

وقيل انهم الذين يُديمون الصيام - وهو ما في الكتب الأوَل: اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو ہمیشہ روزہ رکھتے ہیں - اور یہ حقیقت اگلی کتابوں کے مطابق ہے۔

اب رہا یہ امر کہ سائح کو روزہ دار کیوں کہا گیا اور اس کی وجہِ تسمیہ کیا ہے؟ تو اس پر بحث کرتے ہُوئے موصوف تحریر فرماتے ہیں: وقيل: انما قيل للصائم سائحٌ، لأن الذي يسيح متعبّداً يسيح ولا زاد معه، انما يطعم اذا وجد الزاد - والصائمُ لا يَطعم أيضاً. فلشبهه به سُمّيَ سائحاً: اور کہتے ہیں کہ روزہ دار کو سائح اس وجہ سے کہا گیا ہے کیونکہ جو سیاحت کرتا ہے وہ عبادت گزار کی طرح سیاحت کرتا ہے، جس کے ساتھ کسی قسم کا توشہ نہیں ہوتا۔ اور وہ صرف اُسی وقت کھاتا ہے جب کہ اُس کو کچھ میسر آجائے، اور روزہ دار کا بھی یہی حال ہے۔ لہٰذا اسی مناسبت ومشابہت کی بنا پر روزہ دار کو سائح کہا گیا ہے۔

وسُئل ابن عباس رضؓ وابن مسعود رضؓ عن السائحين، فقال هم الصائمون: نیز ابنِ عباس رضؓ اور ابنِ مسعود رضؓ سے سائحین کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے کہا یہ روزہ دار ہیں۔

نیز موصوف حضرت مسیح علیہ السلام کی وجہِ تسمیہ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ لفظ "مسیح" بھی ساح یسیح سے مشتق ہے۔ کیونکہ بعض اقوال کے مطابق آپ زمین میں چلتے پھرتے تھے اور جہاں کہیں رات ہوجاتی اپنے قدم جما کر نماز کے لئے کھڑے ہوجاتے یہاں تک کہ صبح ہوجاتی۔

پھر مزید تحریر فرماتے ہیں: وسياحة هذه الامة الصيام ولزوم المساجد: اور اس اُمت کی سیاحت روزے رکھنا اور مساجد کو لازم پکڑنا ہے۔ ؎

؎ ملاحظہ فرمائیے لسان العرب، از ابن منظور افریقی مصری، ۲/ ۴۹۳

اور مشہور لغت داں مجدالدین فیروز آبادی اپنی شہرہ آفاق لغت "القاموس المحیط" میں رقمطراز ہیں: والسیاحة .... الذھاب فی الارض للعبادة، ومنه المسیح بن مریم۔ اور سیاحت کے معنی عبادت کی غرض سے زمین میں چلنے کے ہیں اور مسیح ابن مریمؑ اسی سے مشتق ہے۔

والسائح الصائم الملازم للمساجد: اور سائح روزہ دار کو کہتے ہیں جو مسجد کو لازم پکڑے ہوئے ہو۔[۹]

معلوم ہوا کہ سیاحت کے معنی روزہ رکھنا کسی ملاّ کی ایجاد یا کسی عجمی سازش کا نتیجہ نہیں بلکہ عربی لغات و زباندانی کا ایک مسلّمہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عربی کی چھوٹی بڑی تمام لغات میں یہ معنی مذکور و موجود ہیں۔ چنانچہ المعجم الوسیط دنیائے عرب کی ایک جدید ترین لغت ہے، جس کو ماہرین لغت کی ایک جماعت نے ایک علمی ادارے (اکیڈمی) کے ماتحت تیار کیا ہے۔ اور اس میں اس لفظ کے حسب ذیل معنی مذکور ہیں:

(ساحَ) الماءُ ونحوه ـ سَیحاً و سیحاناً: سال وجری۔ یعنی پانی کا بہنا۔

وـ فلان فی الأرض سیحاً وسیحاناً وسیاحةً: ذھب وسار۔ جانا، چلنا۔

وـ ذھب فیھا للتعبد والترھب: عبادت و ریاضت کی خاطر نکلنا۔

وـ لَزِم المسجد: مسجد سے چمٹے رہنا۔

وـ أدام الصوم: دائمی روزہ رکھنا۔

(السائح) الصائمُ الملازم للمساجد: سائح وہ روزہ دار ہے جو مسجدوں میں جما ہوا ہو۔

وـ المتنقل فی البلاد للتنزہ أو للاستطلاع والبحث ونحو ذلك: وہ شخص جو تفریح یا اطلاع یا کسی بحث کی خاطر مختلف شہروں میں پھرنے والا۔[۱۰]

اس میں اگرچہ قدیم معنی کے ساتھ ساتھ بعض جدید معنی کی رعایت بھی ملحوظ رکھی گئی ہے، مگر

---

[۹] القاموس المحیط ۱/۲۳۰، مطبوعہ بیروت۔

[۱۰] المعجم الوسیط ۱/۴۶۷

قدیم مفہومات و تصورات کو بھی جوں کا توں درج کیا گیا ہے۔

اور تو اور دنیائے عرب کی مقبول ترین لغت المنجد ایک عیسائی پادری کی لکھی ہوئی ہے۔ اور اس میں بھی وہی معانی مذکور ہیں جو دیگر کتبِ لغت میں موجود ہیں۔

ساح یسیح سیحاً و سیحاناً و سیاحۃً و سُیوحاً : ذھب فی الارض للعبادۃ و الترھب، جال فی البلاد فھو [سائح] ج سُیّاح و سائحون۔

[السائح] أیضاً الصائم الملازم للمساجد لأنہ یسیح فی النھار بلا زاد[1]

اس پوری بحث سے اتنا تو ظاہر ہو گیا کہ ائمہ لغت اور مفسرین کے نزدیک (بقول زجاج) سیاحت کے معنی روزہ رکھنے کے ہیں۔ مگر اس بحث سے یہ عقدہ نہیں کھلتا کہ اس لفظ کے مفہوم میں روزہ رکھنے کے معنی کیسے اور کس طرح پیدا ہو گئے؟ یعنی تاریخی اعتبار سے یہ مفہوم کب، کس طرح اور کس لئے پیدا ہوا؟ اگرچہ لسان العرب میں مذکور ایک قول — جو اوپر گزر چکا — کی رُو سے یہ بات اگلی کتابوں کے مطابق ہے۔ (وھو ما فی الکتب الأوّل) مگر صحیح احادیث سے اس کی تائید نہیں ہوتی بلکہ ایک دوسری حقیقت سامنے آتی ہے۔ بہر حال اس حقیقت کی عقدہ کشائی ذخیرۂ احادیث کی چھان بین سے بخوبی ہو جاتی ہے اور اس سلسلے کے سارے مسائل و مباحث منطقی اعتبار سے پوری تشفی کے ساتھ حل ہو جاتے ہیں اور اس کے نتیجے میں نہ صرف دین کا تکمیلی کارنامہ (ادیانِ عالم اور خصوصاً اہلِ کتاب کے مقابلے میں) ہمارے سامنے آتا ہے بلکہ حدیث و سُنّتِ رسول کا ایک معلّمانہ اور بصیرت افروز پہلو بھی ہمارے سامنے آتا ہے کہ پیمبر آخر زماں نے اس اُمت کے ذہن و دماغ کے تزکیہ کے لئے کیسے کیسے طریقے اختیار فرمائے اور اہلِ کتاب کے غلط اور مبتدعانہ تصورات اور اُن کے جاہلانہ طرزِ عبادت کو مٹانے کے لئے کیا کیا اصلاحی کارنامے انجام دئے؟

نیز یہ بھی واضح رہے کہ جدید عربی کے مطابق لفظ سیاحت کے معنی و مفہوم میں بعض نئے تصوّرات بھی داخل کر لئے گئے ہیں، جو قدیم عربی اور خاص کر دورِ رسالت میں نہیں پائے جاتے

---

[1] المنجد، از الأب لویس معلوف، ۱۹۵۶ء، بیروت۔

تھے۔ جیسا کہ قدیم و جدید لغات کے تقابلی مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر المعجم الوسیط اور القاموس العصری میں اس لفظ کے جو نئے معنی بیان کئے گئے ہیں وہ قدیم عربی میں موجود نہیں ہیں۔ بہر حال اس لفظ کے وہ معنی جو کلام عرب کے مطابق دورِ رسالت میں مستعمل و مروج تھے اُن پر بحث اگلے صفحات میں آ رہی ہے۔

اب اس موقع پر یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ جن مترجمین و مفسرین نے سائحون اور سائحات کا ترجمہ روزہ رکھنے والے کیا ہے وہ معاذ اللہ خائن و بد دیانت یا آیاتِ الٰہی میں معنوی تحریف کرنے والے نہیں بلکہ انہوں نے پوری بصیرت اور علمی امانت داری کے ساتھ اپنا فرض ادا کیا ہے۔ اب آپ خود ہی فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اس کے خلاف دعویٰ کرنے اور دن کو رات اور رات کو دن بتا کرنے والوں کے متعلق کیا کہا جائے!

سیاحت اور حدیث

اب آیئے ذخیرۂ حدیث پر ایک نظر ڈال کر دیکھیں کہ یہ لفظ کلام عرب کے مطابق دورِ رسالت میں کن کن معنوں میں مستعمل تھا اور وہ مختلف حدیثوں میں کس کس طرح مروی ہے۔ اس جائزے سے نہ صرف حدیث کی ادبی و لسانی اہمیت واضح ہو گی بلکہ قرآنی الفاظ کی بھی صحیح تشریح و تفسیر ہو سکے گی۔ صحیح بات یہ ہے کہ قرآنی الفاظ کے ابہامات و اجمالات کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلا مرجع اور اولین ماخذ حدیثِ رسولؐ ہی ہے۔ کیونکہ خود رب العالمین نے آپ کو یہ حق عطا فرمایا ہے کہ وہ قرآنی مجملات و کلیات کو لوگوں کے سامنے وضاحت کے ساتھ پیش کریں اور اس کے اشکالات کو رفع فرمائیں۔ چنانچہ اس منصبِ جلیلہ کی تعیین قرآن میں اس طرح کی گئی ہے۔

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ۔

اور ہم نے تیرے پاس یہ ذکر (قرآن) بھیجا ہے تاکہ تو لوگوں کے لئے ان تمام باتوں کی وضاحت کر دے جو ان کی طرف بھیجی گئی ہیں اور تاکہ (ان امور میں) غور و فکر سے کام لیں۔ (نحل : ۴۴)

اور دوسری جگہ ارشاد ہے :

وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ : اور ہم نے یہ کتاب تجھ پر اسی لئے اتاری ہے تاکہ تو (لوگوں کے لئے) وہ چیز کھول کر بیان کر دے جس میں انہوں نے اختلاف کیا ہے۔ اور (یہ کتاب) ہدایت و رحمت ہے ان لوگوں کے لئے جو ایمان رکھتے ہیں۔ (نحل: ۶۴)

بہرحال ذخیرۂ حدیث میں یہ لفظ اُن تمام معنوں میں مستعمل ہُوا ہے جو کلام عرب کے مطابق دورِ رسالت میں پائے جاتے تھے۔ جیسا کہ تفصیل گزر چکی۔ سَاحَ يَسِيْحُ کے اصل معنی پانی کے بہنے کے ہیں اور ثانوی اعتبار سے اس کے معنی عبادت و ریاضت کی خاطر گھر سے نکلنے، نیز زمین میں چلنے پھرنے کے بھی ہیں۔ اس طرح اس لفظ کے تین معنی ہُوئے۔

۱۔ پانی کا بہنا یا جاری ہونا؛

۲۔ عبادت و ریاضت کی خاطر گھر سے نکلنا؛

۳۔ چلنا پھرنا۔ (مطلقاً نہ کہ سیر و سیاحت کے معنی میں، جو بعد میں اس سے مستعار لئے گئے)

چنانچہ ان تینوں معنی و مفہوم کی مثالیں ذخیرۂ حدیث میں ملاحظہ فرمائیے۔ تاکہ کسی کو یہ کہنے کا موقع ہی باقی نہ رہے کہ یہ معانی بعد کے ادوار میں گھڑے گئے ہوں گے۔

سیاحت (سیح) بمعنی پانی جاری ہونا

سَاحَ يَسِيْحُ سَيْحاً وَ سَيَحَاناً : پانی بہنا، جاری ہونا۔

مَاءٌ سَيْحٌ : بہتا ہُوا پانی۔

چنانچہ ایک حدیث میں آتا ہے: مَاسُقِيَ بِالسَّيْحِ فَفِيْهِ الْعُشْرُ۔ جو زمین بہتے ہوئے پانی سے سینچی جائے اُس میں عُشر ہوگا۔ یعنی نظام زکوٰۃ کے مُطابق دسواں حصّہ۔

یہاں پر "السیح" کی تشریح کرتے ہوئے صاحب لسان العرب فرماتے ہیں: "ای الماء الجاری"[12]

اس کی مزید تشریح بطور مترادف صحیح مسلم میں اس طرح مذکور ہے:

---

[12] لسان العرب، ۲/۴۹۳

فِيمَا سَقَتِ الْاَنْهَارُ وَالْغَيْمُ الْعُشُوْرُ : جن زمینوں کو نہریں اور بارش کا پانی سیراب کرے ان سب میں دسویں حصّے (بطور زکوٰۃ) دینے ہوں گے۔[۱۳]

اسی طرح امام بخاری نے ایک باب باندھا ہے۔ " العشر فیما یسقی من ماء السماء و بالماء الجاری " یعنی جو زمین بارش یا بہتے ہوئے پانی کے ذریعہ سینچی جائے اس میں عشر کا بیان[۱۴]

اسی طرح ایک مرتبہ انصار نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مطالبہ کرتے ہوئے کہا کہ ان کے لئے ایک بہتی ہوئی نہر کھود دی جائے۔

عن انس بن مالک قال شق علی الأنصار النواضح فاجتمعوا عند النبی صلی اللہ علیہ وسلم یسألونہ أن یکری لھم نھراً سیحاً .... انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ انصار کے لئے اونٹوں کے ذریعہ پانی لا کر سیرابی کا کام مشکل ہوگیا تو وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جمع ہوئے تاکہ وہ یہ مطالبہ کریں کہ آپؐ ان کے لئے ایک بہتی ہوئی نہر کھودیں۔[۱۵]

ایک اور حدیث میں ہے :

عن البراء قال کنا مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی مسیرنا علی رکیّ ذمّة یعنی قلیلة الماء فنزل فیھا ستة أناسا دسھم ماحةً ، فأُدلیت الینا دلو۔ قال و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی شفة الرکیّ، فجعلنا فیھا نصفھا أو قرب ثلثیھا فرفعت الی رسول اللہ فغمس یدہ فیھا ، ففال ماشاء اللہ ان یقول، فعیدت الینا الدلو بما فیھا ، قال فلقد رأیت أحدنا أُخرج بثوب خشیة الغرق ، ثم ساحت یعنی جرت نھراً : حضرت براء بن عازبؓ سے روایت ہے کہ ہم ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے یہاں تک کہ ہم ایک کنویں پر پہنچے جس میں پانی بالکل ہی کم (نہ ہونے کے برابر) تھا۔

---

[۱۳] صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب ما فیہ العشر و نصف العشر، ۲/۶۷۵، مطبوعہ ریاض۔

[۱۴] صحیح بخاری، کتاب الزکاۃ، باب نمبر ۵۵، ۲/۱۳۳، مطبوعہ استنبول۔

[۱۵] مسند احمد : ۳/۱۳۹، مطبوعہ بیروت۔

راوئ حدیث کہتے ہیں کہ (کنویں سے پانی نکالنے کے لئے) چھ آدمی اس میں اُترے اور چھٹا میں خود تھا۔ ہم چلّو سے پانی بھر رہے تھے۔ ہمارے پاس (اُوپر سے) ایک ڈول چھوڑا گیا (تاکہ ہم پانی اس میں بھر دیں) اس حال میں کہ رسول اللہ صلعم کنویں کے کنارے پر تھے۔ پس ہم نے اُس ڈول میں نصف یا دو ثلث کے قریب پانی بھر دیا اور وہ ڈول رسول اللہ صلعم کے پاس (اوپر) اٹھایا گیا۔ پس آپؐ نے اس میں اپنا ہاتھ ڈبویا اور (تھوڑی دیر تک) کچھ پڑھتے رہے۔ پھر ڈول پانی سمیت ہم تک لوٹا دیا گیا۔ حضرت براءؓ کہتے ہیں کہ میں کیا دیکھتا ہوں کہ (یکایک) ہم میں سے ہر شخص ڈوب جانے کے خوف سے اپنی قمیص اُتار رہا ہے۔ (یعنی اس کنویں کا پانی اُوپر اُٹھ رہا ہے)۔ پھر وہ بہہ پڑا یعنی نہر کی شکل میں جاری ہو گیا۔ [۱۶]

اس حدیث میں لفظ "ساحت" ساح یسیح سے فعل ماضی واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے جو اپنے اصل معنی میں استعمال ہُوا ہے۔

اسی طرح حضرت ہاجرہ علیہا السلام کے بارے میں آتا ہے کہ جب انہوں نے صفا و مروہ کے درمیان زمزم کا چشمہ جاری ہوتے ہُوئے دیکھا تو اس کو اطراف سے باڑھ بنا کر روک دیا۔ اس واقعے کے بارے میں رسول اللہ صلعم فرماتے ہیں: یرحمها الله لو ترکتها لکانت عیناً سائحة تجری الی یوم القیامة: یعنی حضرت ہاجرہ اگر اُس چشمے کو ویسے ہی چھوڑ دیتیں تو وہ ایک بہتا ہُوا چشمہ بن جاتا اور قیامت تک جاری رہتا۔ [۱۷]

اس حدیث میں لفظ "سائحة" اسم فاعل مؤنث کا صیغہ ہے۔

سیاحت بمعنی درویشانہ زندگی

الذهاب فی الارض للعبادة والترهب: عبادت و ریاضت کی خاطر گھر سے نکلنا۔ یعنی درویش بن کر زندگی گزارنا۔ یہ مفہوم یہود و نصاریٰ کی پُرمشقت طرزِ عبادت کے لئے مخصوص و

---

[۱۶] مسند أحمد: ۲۹۲/۴، مطبوعہ بیروت۔

[۱۷] مسند أحمد: ۲۵۳/۱، مطبوعہ بیروت۔

مروج تھا جو رہبانیت کا مترادف ہے۔ چنانچہ نسائی کی ایک طویل حدیث میں یہ لفظ ٹھیک اسی معنی میں مستعمل ہوا ہے۔ نیز اس کو ابنِ جریر نے بھی اپنی تفسیر میں روایت کیا ہے۔

عن ابن عباس قال: كانت ملوك بعد عيسىٰ بدّلوا التوراة والانجيل. وكان فيهم مؤمنون يقرؤن التوراة والانجيل. فقيل لملكهم ما نجد شيئاً أشد علينا من شتم يشتمناه هؤلاء. انهم يقرءون (ومن لم يحكم بما انزل الله فاولئك هم الكفرون) هؤلاء للآيات مع ما يعيبوننا به فى قراءتهم. فادعهم فليقرؤا كما نقرأ، وليؤمنوا كما آمنا به. قال فدعاهم فجمعهم، وعرض عليهم القتل أو يتركوا قراءة التوراة والانجيل الا ما بدّلوا منها فقالوا ما تريدون الى ذلك فدعونا. قال فقالت طائفة منهم ابنوا لنا اسطوانة، ثم أعطونا شيئاً نرفع به طعامنا وشرابنا فلا نرد عليكم. وقالت طائفة منهم دعونا نسيح فى الارض ونهيم ونشرب كما تشرب الوحوش، فان قدرتم علينا بأرضكم فاقتلونا. وقالت طائفة ابنوا لنا دوراً فى الفيافى ونحتفر الآبار ونحترث البقول فلا نرد عليكم ولا نمر بكم. وليس أحد من اولئك الا وله حميم فيهم. قال ففعلوا ذٰلك. فانزل الله جل ثناؤه ورهبانية ابتدعوها ما كتبناها عليهم الا ابتغاء رضوان الله فما رعوها حق رعايتها والآخرون قالوا نتعبّد كما تعبّد فلان ونسيح كما ساح فلان. ونتّخذ دوراً كما اتخذ فلان، فهم على شركهم، لا علم لهم بايمان الذين اقتدوا بهم. قال فلما بعث النبى صلى الله عليه وسلم ولم يبق منهم الا قليل، انحط رجل من صومعته، وجاء سائح من سياحة، وجاء صاحب الدار من داره، وآمنوا به وصدّقوه. فقال الله جل ثناؤه (يا ايها الذين آمنوا اتقوا الله وآمنوا برسوله يؤتكم كفلين من رحمته) قال أجرين لايمانهم بعيسى وتصديقهم بالتوراة والانجيل، وايمانهم بمحمد صلى الله عليه وسلم وتصديقهم به. قال (ويجعل لكم نوراً تمشون به) القرآن واتباعهم النبى صلعم۔ [۳۱]

[۳۱] سنن نسائی، کتاب أدب القضاۃ، باب ۱۲، ج ۲ ص ۳۰۵، مطبوعہ دیوبند، نیز تفسیر ابن جریر طبری، ۲۷/ ۱۳۸، مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت

ترجمہ: حضرت ابنِ عباس رضؓ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ کے بعد چند بادشاہ ایسے گزرے کہ انہوں نے تورات اور انجیل کو بدل دیا۔ اور ان میں سے چند اہلِ ایمان ایسے بھی تھے جو تورات اور انجیل کو (اپنی اصلی شکل میں) پڑھتے تھے۔ تو اُن میں سے (چند حاسدوں نے) اپنے بادشاہ سے شکایت کرتے ہوئے کہا کہ یہ لوگ جو ہم کو (تورات وانجیل کے مسخ کئے جانے اور ان کو بگاڑے جانے کے بارے میں) سب وشتم کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ شاق ہم پر دوسری کوئی چیز نہیں ہے۔ اور یہ لوگ اپنی کتابوں میں یہ بھی پڑھتے ہیں۔ (اور جو کوئی اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلہ نہ کرے وہ کافر ہے) اور اس کے علاوہ بھی ان کی کتابوں میں بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن کی وجہ سے وہ ہماری عیب گیری کرتے ہیں۔ لہٰذا تو انہیں بلا کر تاکید کر کہ وہ (تورات وانجیل کو) اسی طرح پڑھیں جس طرح ہم پڑھتے ہیں، اور اُس کے بارے میں وہی عقیدہ رکھیں جو ہمارا ہے۔ ابنِ عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس طرح بادشاہ نے اُن ایمانداروں کو بُلوایا اور کہا کہ یا تو اپنی کتابوں کو چھوڑ کر ہماری اصلاح کردہ کتابوں کی پیروی کرو یا پھر قتل ہونے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ انہوں نے کہا کہ اس سے تمہارا کیا مطلب ہے، ہم کو ہمارے حال پر چھوڑ دو۔ (مگر پھر اُن پر کی جانے والی سختی کی بنا پر باہمی صلاح ومشورے سے ان میں تین فرقے بن گئے، اور) اُن میں سے ایک فرقے نے کہا کہ (اچھا تو دیکھو ہم کو تمہارے عتاب سے بچنے کی ایک صورت یہ نظر آتی ہے کہ ہم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم چھوڑ کر ایک گوشۂ تنہائی میں جا بستے ہیں لہٰذا) تم ہمارے لئے ایک مینار بنوا دو (جس میں ہم جا بسیں گے) پھر کوئی ایسی چیز (رسّی وغیرہ) دے دو جس کے ذریعہ ہم اپنا کھانا پینا اُوپر لے لیا کریں گے اور تمہارے پاس پھر کبھی نہیں آئیں گے (تاکہ تم کو ہماری وجہ سے کوئی تکلیف نہ ہو)۔ اور ان میں سے ایک دوسری جماعت نے کہا کہ ہم کو ہمارے حال پر چھوڑ دو۔ ہم زمین میں درویشی کرتے ہوئے (یہاں سے نکل جائیں گے) اور آوارہ گردی کرتے ہوئے جنگلی جانوروں کی طرح کھاتے پیتے پھریں گے۔ (پھر کبھی اس طرف کا رُخ نہیں کریں گے)۔ پھر اگر کبھی تم ہم کو اپنی بستی میں دیکھ لو تو تمہیں اختیار ہے کہ تم ہم کو مار ڈالو۔ اور تیسری جماعت نے کہا کہ کسی بیابان میں ہمارے لئے کچھ مکانات بنوا دو۔ ہم وہاں پر کنویں کھود لیں گے اور (اپنے گزارے کے لئے نباتات و) ترکاریاں اُگا لیں گے۔ پھر کبھی تمہاری طرف

رُخ نہیں کریں گے۔ چونکہ ان اہلِ ایمان لوگوں کی دوسروں کے ساتھ قریبی رشتہ داریاں تھیں (لہٰذا ان رشتہ داریوں کا خیال کرتے ہوئے) ان کی درخواستیں منظور کر لی گئیں۔

اس وجہ سے یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی: (وہ درویشی جو اُنہوں نے خود ایجاد کی وہ ہم نے ان پر فرض نہیں کی تھی، مگر انہوں نے رضائے الٰہی حاصل کرنے کے لئے ایسا کیا مگر وہ اسے نباہ نہ سکے جیسا کہ نباہنا چاہیئے تھا۔)

(یہ تو ان جماعتوں کا حال ہُوا، مگر ان کے علاوہ عوام میں چند) دوسرے لوگ بھی تھے (جو محض تقلیداً اُن کے ساتھ ہو گئے) اور اُنہوں نے کہا کہ ہم بھی اسی طرح عبادت کریں گے جس طرح فلاں نے کی ہے اور اسی طرح درویشی کریں گے جس طرح فلاں نے کی ہے، اور اسی طرح ہم بھی (دُور دراز مقامات پر ویرانوں میں) مکانات بنا کر رہیں گے جس طرح فلاں نے بنایا ہے۔ تو ان لوگوں نے محض (تقلیداً) ان کے ساتھ شریک رہنے کی غرض سے ایسا کیا، اگرچہ ان کو اپنے مقتداؤں کے (مرتبہ و) ایمان کی کوئی خبر نہیں تھی۔

ابنِ عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہُوئے تو اُس وقت اُن لوگوں میں سے صرف ایک قلیل جماعت ہی باقی رہ گئی تھی۔ (تو نبی آخر زماں کی بعثت کی خوش خبری سن کر) جو شخص اپنی خانقاہ میں تھا وہ باہر نکلا، اور جو درویش بن کر بیابانوں میں جا بسا تھا وہ اپنی درویشی (سیاحت) چھوڑ کر آ کھڑا ہُوا، اور جو اپنے گھر میں محصور ہو گیا تھا، وہ بھی اپنے گھر سے نکل آیا۔ (اس طرح وہ گویا کہ آزاد ہو کر باہر نکلے) اور نبیؐ پر ایمان لائے اور اس کی تصدیق کی۔ انہی لوگوں کی شان میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ (اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور اُس کے رسول پر ایمان لاؤ، وہ تمہیں اپنی رحمت کا دوہرا حصّہ دے گا) یعنی ایک اجر تو حضرت عیسیٰؑ پر ایمان لانے اور تورات و انجیل کی تصدیق کرنے کا اور دوسرا اجر حضرت محمد صلعم پر ایمان لانے اور ان کی تصدیق کرنے کا۔ (اور تمہیں ایک نُور دے گا جس کی روشنی میں تم چلو پھرو گے)۔ یعنی یہ نُور قرآن اور اتباعِ رسول ہے۔

اس طویل حدیث کی عربی عبارت میں خط کشیدہ الفاظ ملاحظہ فرمائیے۔ جو یہ ہیں:

دعونا نسیح فی الارض: (ہم زمین میں درویشی کرتے پھریں گے)

ونسیح کما ساح فلان : (ہم اس طرح درویشی کریں گے جس طرح فلاں نے کیا ہے)

وجاء سائح من سیاحتہ : (درویش اپنی درویشی سے باہر نکل آیا)

دیکھئے یہ تمام تفصیلات جنگلوں اور بیابانوں میں فقیرانہ زندگی گزارنے کے علاوہ اور کیا ہیں؟

اور پھر یہ بھی ملاحظہ فرمائیے کہ یہ ساری "سیاحتی زندگی" رہبانیت ہی کا دوسرا رُوپ ہے جو بطور ایک بدعت جاری کی گئی تھی۔ اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کی مذمت فرمائی ہے کہ ایک تو اُنہوں نے ایک غیر مشروع چیز ایجاد کی، مگر اس کے باوجود وہ اس کو نباہ نہ سکے، بلکہ اُن میں سے بہت سے لوگ بداعمالیوں میں مبتلا ہو گئے۔ جیسا کہ قرآن نے ان کے بارے میں فرمایا ہے۔ (وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فَاسِقُونَ)

بالکل اسی معنی میں ابن جریر نے بنی اسرائیل کا بھی ایک واقعہ نقل کیا ہے :

(عن) وھب ابن منبہ یقول کانت السیاحۃ فی بنی اسرائیل، وکان الرجل اذا ساح اربعین سنۃ رأی ماکان یری السائحون قبلہ ۔ فساح ولد بغی اربعین سنۃ ۔ فلم یر شیئاً ۔ فقال أی رب أرأیت ان أساء أبوای وأحسنت أنا ؟ قال، فأری ما رأی السائحون قبلہ : وہب بن منبہ سے مروی ہے کہ بنی اسرائیل میں سیاحت (درویشی) کا رواج تھا۔ جب کوئی شخص چالیس سال تک درویشی کرتا تو اس کو وہ چیز حاصل ہو جاتی جو اس سے پہلے والے درویشوں کو حاصل ہو چکی تھی۔ (یعنی عرفان)۔ تو ایسا ہُوا کہ ایک بدکار عورت کے لڑکے نے چالیس سال تک درویشی کی مگر اسے کچھ بھی حاصل نہ ہُوا تو بارگاہِ الٰہی میں شکایت کی کہ اے پروردگار اگر میرے والدین نے بُرائی کی اور میں نے اچھائی کی تو (اس میں میرا کیا قصور ہے ؟) تو اس کو بھی پہلے والوں کی طرح عرفان حاصل ہو گیا۔[۱۹]

اس موقع پر یہ وضاحت بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ اہلِ کتاب کے نزدیک "سائح" کا جو مفہوم تھا اس پر ابن جریر نے ابنِ عُیینہ کے حوالے سے اس طرح روشنی ڈالی ہے :

اذا ترك الطعام والشراب والنساء فھو السائح : جو شخص کھانا پینا اور عورتوں سے ملنا چھوڑ دے تو وہ سائح کہلاتا ہے۔[۲۰]

---

[۱۹] تفسیر ابن جریر الطبری : ۱۱/ ۳۹

[۲۰] جامع البیان فی تفسیر القرآن، المعروف بتفسیر ابن جریر الطبری، ۱۱/ ۲۹

اور اس کی بگڑی ہوئی شکل آج بھی عیسائیوں کے ہاں "مقدس باپوں" یا کنواروں کی صورت میں رائج ہے۔

نیز اسی طرح صحیح بخاری میں حضرت عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہے کہ آغازِ اسلام میں جب مسلمانوں کو حد سے زیادہ ستایا جانے لگا تو حضرت ابوبکر صدیقؓ ملکِ حبشہ کو ہجرت کرنے کی غرض سے نکل کھڑے ہُوئے۔ راستے میں آپ کی ملاقات ابنِ دَغِنَہ سے ہوئی۔ اس نے مقصدِ سفر دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: "أخرجنی قومی فأرید أن أسیح فی الارض و أعبد ربی"۔ یعنی میری قوم نے مجھے (اپنے یہاں سے) نکال دیا ہے۔ لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ (اللہ کی) زمین میں درویشی کروں اور اپنے رب کی عبادت کروں۔ [۲۱]

یہاں پر "اسیح" اور "اعبد" دونوں الفاظ ایک دوسرے کی تشریح کر رہے ہیں اور ان دونوں کا مراد و مفہوم یکساں نظر آ رہا ہے۔

امام رازی نے سیاحت کی حقیقت اور اس کے اصل لغوی مفہوم پر اس طرح روشنی ڈالی ہے۔

أصل السیاحت الغرب فی الأرض والاتساع فی السیر والبعد عن المدن و موضع العمارة، مع الاقلال من الطعام والشراب: سیاحت اصل میں کھانے پینے کی کمی کے ساتھ ساتھ زمین میں گھومنا، چلنے پھرنے میں وسعت اختیار کرنا اور شہروں اور تمدنی ہنگاموں سے دُور رہنا۔ [۲۲]

سیاحت بمعنی زمین میں نقل و حرکت

سَاحَ فِی الْاَرْضِ یَسِیْحُ سِیَاحَةً وَسُیُوْحاً وَسَیْحاً وَسَیَحَاناً: أی ذھب [۲۳] یعنی جانا چلنا (مطلق نقل و حرکت)۔ اس میں سیر و سیاحت کا وہ مفہوم نہیں پایا جاتا جو جدید عربی میں مستعمل ہے۔

چنانچہ یہ مفہوم بھی کئی حدیثوں میں وارد ہُوا ہے۔ مثلاً:

---

۲۱ بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب ۴۵، باب ہجرة النبی صلعم و اصحابہ الی المدینة، ۲۵۴/۴، مطبوعہ استانبول۔

۲۲ تفسیر کبیر، ۲۱۹/۱۵، جدید ایڈیشن۔

۲۳ لسان العرب، ۲/ ۴۹۲-۴۹۳، مطبوعہ بیروت۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم : یخرج الدجال فی خفقۃ من الدین و ادبار من العلم ۔ فلہ اربعون لیلۃ یسیحھا فی الأرض : رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ دجال اس حال میں ظاہر ہوگا کہ دین کمزور ہو چکا ہوگا اور علم پیچھے رہ گیا ہوگا۔ اس کے لئے چالیس راتیں ہوں گی جن میں وہ زمین میں چلتا پھرتا رہے گا۔[۲۴]

ایک دوسری حدیث میں ہے :

قال رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم ان ملائکۃ اللہ فی الأرض سیاحین یُبلّغونی من اُمتی السلام : رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ زمین میں اللہ کے فرشتے گھومتے رہتے ہیں، جو میری اُمت کا سلام مجھ تک پہنچاتے ہیں۔[۲۵]

اس میں لفظ "سیّاحین" سیاح کی جمع ہے جو فرشتوں کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔[۲۶]

سیاحت بمعنی جدید

اس جائزے سے بخوبی ظاہر ہو گیا کہ زبان و ادب کے اکثر و بیشتر الفاظ اور ان کی تعبیریں اپنی اصل شکل و صورت میں ذخیرۂ حدیث میں موجود و محفوظ ہیں جو عربی زبان و ادب کا بھی بہترین سرمایہ ہیں۔ اور راویانِ حدیث نے ــــ اللہ تعالیٰ اُن کی تُربت کو ٹھنڈا رکھے ــــ ان تمام الفاظ و اسالیب کو جوں کا توں ہم تک پہنچا کر نہ صرف قرآن و حدیث کے سرمائے ہی کو زمانے کی دستبرد سے محفوظ کر دیا ہے بلکہ ثانوی طور پر ادب کی بھی بیش بہا خدمت انجام دی ہے۔

میرا موضوعِ بحث اس وقت اس بات کا جائزہ لینا ہے کہ قرآنی لفظ "سائحون" اور "سائحات" کا اصل مفہوم کیا ہے؟ اور پھر اس میں روزہ رکھنے کے معنی کس طرح پیدا ہو گئے؟ تو پچھلے مباحث

---

[۲۴] مسند احمد بن حنبل : ۳/۳۶۷، مطبوعہ بیروت۔

[۲۵] مسند احمد : ۱/۳۸۷، نسائی : کتاب السھو، باب التسلیم علی النبی صلعم ۱/۱۸۹، مطبوعہ دیوبند، دارمی : باب فی فضل الصلوٰۃ علی النبی صلعم، ۲/۳۱۷۔ مطبوعہ بیروت۔

[۲۶] فرشتوں کے لئے سیاح کا لفظ دیگر مواقع پر بھی آیا ہے۔ ملاحظہ ہو : ترمذی، ابواب الدعوات، مسند احمد : ۱/۴۴۱، ۲/۲۵۲، ۲۵۹

سے یہ بات بخوبی ظاہر ہوگئی کہ اس کے اصل معنی پانی بہنے اور جاری ہونے کے ہیں۔ اور ثانوی طور پر یا مجازاً یہ عبادت و ریاضت کے لئے گھر سے نکلنے یا زمین میں چلنے پھرنے کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ اور یہ مجازی مفہوم شاید اس مناسبت سے ہو کہ جس طرح پانی زمین پر بہتے ہوئے "زندگی" کے لئے ایک نفع بخش چیز اور مخلوق کے لئے منفعت رساں ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک شخص جب راہِ خدا میں نکلتا ہے تو گویا وہ بھی مخلوق کے منافع کا باعث ہوتا ہے۔ مگر سیر و سیاحت کا جو مفہوم موجودہ دور میں پایا جاتا ہے، اس کا تصور اس لفظ کے اصل مفہوم کے مطابق دورِ قدیم میں نہیں تھا، اور نہ یہ لفظ اس معنی کے لئے وضع ہوا تھا، جیسا کہ پچھلے تمام مباحث سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے۔ اس کا مفہوم زیادہ سے زیادہ زمین میں آزادانہ نقل و حرکت پر دلالت کرتا ہے۔ اور خود قرآنِ حکیم میں بھی یہ لفظ ایک دوسرے موقع پر ٹھیک اسی معنی میں مستعمل ہوا ہے:

فَسِيحُوا فِي الْأَرْضِ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللَّهِ : تم زمین میں چار مہینوں تک (آزادی کے ساتھ) چلو پھرو، اور جان رکھو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو۔ (توبہ:۱)

دیکھئے یہاں پر مطلق چلنا پھرنا یا زمین پر آزادانہ نقل و حرکت کرنا مُراد ہے۔ سیر و سیاحت کا مفہوم بالکل نہیں نکلتا۔ نیز ایک اور قابلِ غور بات یہ ہے کہ چاہے "درویش" کا ذکر ہو یا مطلق زمین میں چلنے پھرنے کا، دونوں میں "فی الارض" کا تذکرہ لازمی نظر آتا ہے۔ گویا کہ عربی زبان میں کسی فعل کے طریقۂ استعمال کے مطابق بطور "صلہ" ہے۔ چنانچہ آپ قرآن اور حدیث کی مذکورۂ بالا تمام مثالوں پر دوبارہ نظر ڈالئے تو آپ کو ہر جگہ یہی بات نظر آئے گی۔ اور یہی وجہ ہے کہ یہ خاص مفہوم موجودہ دور کے "سیر و سیاحت" کے مفہوم سے میل نہیں کھاتا، جو بعد میں اس لفظ سے مستعار لیا گیا ہے۔ اور زیادہ وضاحت مطلوب ہو تو دیکھئے پچھلے صفحات میں فرشتوں کے لئے "سیاحین" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو سیاح کی جمع ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں پر مطلق گھومنے پھرنے کے اور کوئی دوسرا مفہوم نہیں نکل سکتا۔ اور یہ مفہوم موجودہ "سیاح" کے مفہوم سے بالکل مغائر ہے۔ ورنہ لازم آئے گا کہ خدانخواستہ فرشتے بھی سیر و تفریح کیا کرتے ہیں۔ اور یہ ایک لغو بات ہوگی۔

سیاحت اسلام میں

اس بحث سے بخوبی ظاہر ہو گیا کہ لفظ سیاحت کا قدیم مفہوم موجودہ دور کے پُر تکلف سیر و سیاحت

اور پکنک وغیرہ قسم کے شاندار اسفار کے بالکل برعکس ہے ۔

واضح رہے کہ یہاں پر صرف اس لفظ کی لغوی حیثیت پر بحث ہو رہی ہے ، نہ کہ اس کی شرعی و فقہی حیثیت پر ۔ اگرچہ سیر و سیاحت کرنا یا کسی خاص مقصد کی خاطر سفر کرنا اسلام کی نظر میں بُرا نہیں ہے بلکہ بہت سے اسفار ایسے بھی ہو سکتے ہیں جن پر اسلام نے خود ہی اُبھارا ہے ۔ مثلاً قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ : کہہ دو کہ زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ مجرم لوگوں کا انجام کیسا ہُوا ! (نمل : ۶۹)

اور ایک دوسری جگہ اس اجمال کی تفصیل اس طرح کی گئی ہے کہ " سیر فی الارض " کا مقصد زمین کے آثار و باقیات کے مشاہدہ کے ذریعہ سبق آوری اور عبرت و بصیرت کا حصول ہے ، جو دلوں کے اندھے پن کو دُور کرنے کا بھی ایک ذریعہ ہے ۔

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَا اَوْ آذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ؟ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ : کیا اُنھوں نے زمین میں چل پھر کر نہیں دیکھا کہ اُن کے دل ایسے ہو جاتے جن سے وہ سمجھتے ، یا ایسے کان ہو جاتے جن سے وہ سُنتے ؟ حقیقت تو یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہوتے ہیں جو سینوں میں ہیں ۔ (حج : ۴۶)

اگر اس " سیر فی الارض " کے ذریعہ یہ مقصد حاصل نہ ہو تو اس صورت میں بھی ایسے اسفار اس قسم کی آیات کی رُو سے قابلِ اعتراض ہو سکتے ہیں ۔ اس موضوع پر اس سے زیادہ تفصیل کی اس وقت گنجائش نہیں ہے ۔

بہر حال اس تحقیق کے بعد اب ہم کو دیکھنا ہے کہ اس لفظ کے مفہوم میں روزہ رکھنے کے معنی کیسے اور کس طرح پیدا ہو گئے ؟ چنانچہ معنائے دوم کے مطابق ظاہر ہو گیا کہ اس لفظ کے مجازی یا ثانوی معنی اولین طور پر عبادت و ریاضت کی خاطر گھر سے نکلنے کے ہیں جو رہبانیت کا مترادف ہے ۔ بالفاظِ دیگر اہلِ کتاب کے یہاں مروجہ رہبانیت کی تعبیر عربوں کے یہاں " سیاحت " کے لفظ سے کی جاتی تھی ۔ مگر جب اسلام آیا تو جہاں اس نے بہت سے قدیم و جاہلانہ افعال و تصورات کی اصلاح کی اور بہت سارے الفاظ کے معانی و مفہومات بدل دیئے ، اسی طرح اس نے رہبانیت کے اس غلط رواج کی بھی اصلاح کرتے ہُوئے

فرمایا کہ اب اس غیر فطری طریقۂ عبادت کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ بلکہ اس کے برعکس اس نے روزہ اور جہاد وغیرہ کو رہبانیت کا نعم البدل قرار دیا۔ جیسا کہ مختلف احادیث سے اس مسئلے پر بخوبی روشنی پڑتی ہے۔

سیاحت اور جہاد

چنانچہ بعض احادیث میں وضاحت کی گئی ہے کہ جہاد اس اُمت کی سیاحت ہے:

عن أبي امامة أن رجلاً قال یا رسول اللہ! ائذن لی فی السیاحۃ۔ قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: ان سیاحۃ أمتی الجہاد فی سبیل اللہ تعالیٰ: ابو امامہؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے کہا کہ "یا رسول اللہ مجھے 'سیاحت' کی اجازت دیجئے۔" تو آپؐ نے فرمایا کہ "میری اُمت کی سیاحت جہاد فی سبیل اللہ ہے۔" [۲۷]

اصل میں چونکہ اہلِ عرب کے نزدیک اہلِ کتاب کی دینی اعتبار سے زمانۂ قدیم سے بہت زیادہ قدر و منزلت تھی اور ان کی ہر ادا کو وہ وقعت اور بزرگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ لہٰذا اسلام نے نفسیاتی اعتبار سے ان جذبات اور میلانات کا رُخ دوسری طرف موڑتے ہوئے چند نسخے تجویز کئے۔ چنانچہ مذکورۂ بالا حدیث اور اس کے الفاظ و اُسلوب پر ایک نظر ڈالتے ہی اس نتیجے کی صداقت صاف نظر آتی ہے۔ ورنہ لفظ سیاحۃ کے بعد بطور اضافت "اُمتی" کا لفظ بڑھانے کی کوئی دوسری وجہ نظر نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ بعض دیگر احادیث میں جہاد کو صاف صاف "اسلام کی رہبانیت" قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ ایک شخص کے اس سوال پر کہ "یا رسول اللہ مجھے کچھ تلقین فرمائیے۔" آپؐ نے خصوصیت کے ساتھ ارشاد فرمایا:

وعلیک بالجہاد فانہ رہبانیۃ الاسلام: جہاد کو اپنے اُوپر لازم کرلو، کیونکہ یہ اسلام کی رہبانیت ہے۔ [۲۸]

---

[۲۷] سنن ابو داؤد، کتاب الجہاد، باب النہی عن السیاحۃ، ۱۲/۳، مطبوعہ حمص

[۲۸] مسند احمد بن حنبل: ۸۲/۳

اسی طرح ایک دوسری حدیث میں مذکور ہے :

لکل نبیٍّ رھبانیۃ و رھبانیۃ ھذہ الامۃ الجھاد فی سبیل اللہ عز وجل :

ہر نبی کے لئے ایک مخصوص قسم کی رہبانیت تھی، اور اس اُمت کی رہبانیت جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ [۲۹]

یہاں پر لفظ رہبانیت محض "صفت مشاکلت" کے طور پر مذکور ہے۔ ورنہ صاف ظاہر ہے کہ جہاد اور رہبانیت کے تصورات میں بالکل تضاد پایا جاتا ہے۔ بہرحال اس سے دو حقیقتیں ثابت ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ سیاحت اور رہبانیت دراصل ایک ہی چیز کے دو نام یا ایک ہی سکّے کے دو رُخ تھے۔ اور دوسری حقیقت یہ ثابت ہوتی ہے کہ جہاد کے ذریعہ دراصل عیسائیت کے تصورِ رہبانیت کو توڑ کر مسلمانوں میں کارزارِ حیات کو گرم کرنے اور جہدِ مسلسل کی اسپرٹ پیدا کرنی مقصود تھی، تاکہ مسلمان جہادِ زندگانی سے مُنہ موڑ کر اور تمدنی ہنگامہ آرائیوں سے کنارہ کشی اختیار کر کے کسی ایک کونے کے ہو کر نہ بیٹھ جائیں۔ اس طرح سورۂ توبہ کی زیرِ بحث آیات میں "جہاد اور سیاحت" کے تعلق پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

عیسائیوں میں رہبانیت کی ایک خاص شکل تمدنی ہنگامہ آرائیوں سے کنارہ کشی کے علاوہ چونکہ عورتوں کی قربت سے مکمل پرہیز کرنا یعنی تجرّد کی زندگی اختیار کرنا بھی تھا، جیسا کہ قتادہ سے منقول ہے :

ورھبانیۃ ابتدعوھا، قال ذکر لنا انھم رفضوا النساء واتخذوا الصوامع : اور اُنہوں نے درویشی کی بدعت جاری کی۔ قتادہ کہتے ہیں کہ ہم سے ذکر کیا گیا ہے کہ اُنہوں نے عورتوں کو چھوڑ دیا اور عبادت گاہوں کو پکڑ لیا۔ [۳۰]

اس لئے اسلام میں اس قسم کی تجرّد پسندانہ زندگی اور تصورِ حیات کی بھی نفی کی گئی، کیونکہ اس سے بہت سے مفاسد پیدا ہو سکتے ہیں اور نظامِ تمدن درہم برہم ہو سکتا ہے۔ اسی معنی میں یہ حدیث بھی مروی ہے :

ان الرھبانیۃ لم تکتب علینا : ہم پر درویشی مشروع نہیں کی گئی ہے [۳۱]

---

[۲۹] مسند احمد بن حنبل : ۶/۲۶۶ ۔

[۳۰] الدر المنثور فی التفسیر الماثور، از جلال الدین سیوطی : ۶/۱۷۸، مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت۔

[۳۱] مسند احمد : ۶/۲۲۶ ۔

نیز ایک صحابی عثمان بن مظعون کے متعلق جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع ملی کہ انہوں نے تجرد کی زندگی اختیار کرلی ہے تو آپؐ نے اُنہیں بلا کر فرمایا :

انی لم أؤمر بالرھبانیۃ، أرغبت عن سنتی ؟ مجھے رہبانیت یا درویشی کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔ کیا تم نے میری سُنت سے اعراض کیا ہے ؟ تو صحابی مذکور نے کہا' نہیں۔ پھر رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ دیکھو میری سُنت یہ ہے کہ مَیں نماز بھی پڑھتا ہُوں' سوتا بھی ہُوں' روزہ بھی رکھتا ہُوں' کھاتا بھی ہوں' نکاح بھی کرتا ہُوں اور طلاق بھی دیتا ہُوں۔ لہٰذا جس نے میری سُنت سے مُنہ موڑا وہ مجھ سے نہیں ہے۔[۳۲]

سیاحت اور روزہ

اب رہا معاملہ روزے کا' تو اس سلسلے میں حضرت عائشہؓ صدیقہؓ سے مروی ہے :

عن عائشۃ قالت سیاحۃ ھذہ الامۃ الصیام : حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ اس اُمت کی سیاحت روزہ رکھنا ہے۔[۳۳]

دیکھئے اُوپر جس طرح جہاد کے بارے میں سیاحت کی نسبت اُمتِ محمدیہ کی طرف کی گئی تھی اسی طرح یہاں بھی کی گئی ہے۔ اس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ اسلام میں سیاحت یا رہبانیت کے تصورات کو توڑنے کے لئے دراصل مختلف طریقے آزمائے گئے، جن میں سے ایک جہاد بھی تھا تو دوسری طرف روزہ بھی ہے۔ اور جیسا کہ آگے بیان ہوگا اس سے طلبِ علم وغیرہ کی خاطر سفر کرنا بھی ہو سکتا ہے، مگران تمام مطالب و مقاصد میں روزہ رکھنا سب سے زیادہ مشہور ہوگیا۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ یہ ہر کس و ناکس کے لئے آسان اور سہل العمل نظر آتا ہے، بخلاف جہاد کرنے یا علم کی خاطر سفر کرنے یا ہجرت کرنے وغیرہ کے۔ اس طرح اُمتِ اسلامیہ کے تمام طبقات اپنے اپنے احوال و ظروف کے مطابق اس کا مصداق بن سکتے ہیں اور اس میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

روزہ رکھنے کے بارے میں حضرت عائشہؓ کے علاوہ حضرت ابوہریرہؓ، حضرت ابنِ عباسؓ اور

۳۲؎ سنن دارمی' کتاب النکاح : ۱۳۳/۲' مطبوعہ بیروت۔

۳۳؎ جامع البیان فی تفسیر القرآن' از ابنِ جریر الطبری : ۲۹/۱۱۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جیسے جلیل القدر صحابہ کرام اور بہت سے تابعین سے بھی کثیر روایات منقول ہیں جو کتبِ تفاسیر میں مذکور ہیں۔

بہرحال سائحون سے روزہ رکھنے والے مراد لینا اس کثرت کے ساتھ مشہور و مروج ہوا کہ وہ عُرفاً اس لفظ کے لغوی مفہوم میں داخل ہو کر زبان و ادب کا جزو بن گیا۔ یہی وجہ ہے کہ لغات کی تمام کتابیں "سیاحت" کے اس عُرفی مفہوم سے بھری ہوئی نظر آتی ہیں، جیسا کہ تفصیل اُوپر گزر چکی۔ لہٰذا اکثر مفسرین و مترجمین نے "سائحون اور سائحات" سے مُراد روزہ رکھنے والے مرد اور عورتیں لیا ہے اور اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے تو اُنہوں نے کونسا جرم کیا اور کونسی علمی خیانت کی ہے ؟

مفسرین کی رائے

تفسیر ابنِ جریر، تفسیر ابنِ جوزی، تفسیر ابنِ کثیر، تفسیر قرطبی، تفسیر روح المعانی اور دیگر تمام قدیم اور معتبر و مشہور تفاسیر میں اس کا یہی مُرادی و عُرفی مفہوم بیان کیا گیا ہے کہ اس سے مُراد روزہ رکھنے والے ہیں۔ حتیٰ کہ علامہ زمخشری، قاضی بیضاوی اور امام رازی جیسے ائمہ فن تک نے ـــــ جو اپنی عقلیت پسندی میں مشہور ہیں ـــــ اسی معنیٰ و مفہوم کو اولیت دی ہے اور اس کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا ہے۔ چنانچہ علامہ زمخشری ـــــ جو زبان و ادب کے مُسلّم امام ہیں ـــــ تحریر کرتے ہیں :

و (السائحون) الصائمون، شُبّھوا بذوی السیاحۃ فی الأرض فی امتناعھم من شھواتھم۔ وقیل ھم طلبۃ العلم یسیحون فی الارض، یطلبونہ فی مظانہ۔[۳۴]

ترجمہ : سائحون سے مراد روزہ دار ہیں۔ ان کو زمین میں سیاحت کرنے والوں سے تشبیہ اپنی خواہشات سے رُکے رہنے کی وجہ سے دی گئی ہے۔ نیز یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد وہ طالب علم ہیں جو زمین میں علم کی تلاش میں گھومتے اور اس کو مطلوبہ مقامات سے حاصل کرتے رہتے ہیں۔

قاضی بیضاوی تحریر فرماتے ہیں :

۳۴؎ الکشاف عن حقائق التنزیل وعیون الأقاویل فی وجوہ التاویل المعروف بہ تفسیر کشاف، از علامہ جاراللہ محمود زمخشری : ۲/۲۱۶، انتشارات آفتاب تہران۔

السائحون الصائمون لقوله عليه السلام سياحة أمتي الصوم۔ شُبِّه بها من حيث أنه يُعوّق عن الشهوات، أولأنه رياضة نفسانية يُتوصّل بها الى الاطلاع على خفايا الملك والملكوت أو السائحون للجهاد أو لطلب العلم : سائحون سے مراد روزہ دار ہیں، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میری اُمت کی سیاحت روزہ رکھنا ہے۔ یہ تشبیہ اس بنا پر ہے کہ روزہ خواہشاتِ نفس کو روکنے والا ہے۔ یا اس وجہ سے ہے کہ یہ ایک نفسانی ریاضت ہے جس کے ذریعہ ملک اور ملکوت کے بھیدوں کی اطلاع ملتی ہے۔ نیز اس سے مراد وہ لوگ بھی ہوسکتے ہیں، جو جہاد یا طلبِ علم کی خاطر سیاحت کرنے والے ہوں۔[۳۵]

امام رازی نے اس کے مفہوم و مقتضیٰ پر عقل و نقل کی روشنی میں سب سے زیادہ مفصل بحث کی ہے، مگر چونکہ عبارت بہت طویل ہے اس لئے صرف اُردو ترجمے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

فرماتے ہیں کہ: "السائحون کے بارے میں چند اقوال مروی ہیں جو یہ ہیں:

قول اول: عام مفسرین کے نزدیک اس سے مراد روزہ دار ہیں۔ ابنِ عباسؓ کہتے ہیں کہ قرآن میں جہاں بھی سیاحت کا لفظ آیا ہے اس سے مراد روزہ رکھنا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میری اُمت کی سیاحت روزے رکھنا ہے۔ حسنؒ سے مروی ہے کہ اس سے فرض روزے مُراد ہیں۔ نیز کہا گیا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو روزے رکھنے پر مُداومت کرتے ہیں۔ بہرحال سائح کی تفسیر صائم کے معنی میں جس سبب سے بہتر نظر آتی ہے وہ دو ہیں:

پہلی وجہ یہ ہے کہ ازہری نے کہا ہے کہ صائم کو سائح اس وجہ سے کہا گیا ہے، کیونکہ جو شخص زمین میں عبادت گزار کی حیثیت سے چلتا پھرتا رہے گا اس کے ساتھ زادِ راہ نہیں ہوگا، اس طرح وہ کھانے سے رُکا رہے گا۔ اور صائم بھی اسی طرح کھانے سے رُکا رہتا ہے۔ اس مشابہت کی وجہ سے صائم کو سائح کہا گیا ہے۔

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ سیاحت کی اصل زمین میں مسلسل چلتے رہنا ہے، جس طرح کہ پانی بہتا رہتا

---

[۳۵] أنوار التنزيل و أسرار التأويل، المعروف بہ تفسیر بیضاوی، ۲۲۱/۲، مطبوعہ دیوبند۔

ہے۔ اسی طرح روزہ دار بھی اپنی خواہشات یعنی خورد و نوش اور مجامعت سے باز رہتے ہُوئے (مسلسل) اطاعتِ الٰہی میں لگا رہتا ہے۔ اور میرے نزدیک (ان دونوں کے علاوہ) ایک وجہ اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ انسان جب اکل و شرب اور مجامعت وغیرہ کو ترک کر کے شہوات کا دروازہ اپنے اُوپر بند کر لیتا ہے، تو اس پر حکمت کے ابواب کُھل جاتے ہیں اور عالمِ جلال کے انوار جلوہ افروز ہو جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص چالیس دن تک اللہ کے ساتھ اخلاص کا معاملہ کرتا ہے اُس پر حکمت کے سوتے اُس کے قلب و زبان سے ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ اس طرح وہ اُن "سائحین" میں ہو جاتا ہے جو اللہ کے عالمِ جلال میں ہو کر ایک مقام سے دوسرے مقام تک اور ایک درجے سے دوسرے درجے تک منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ اس طرح اس کو عالمِ روحانیات کی سیاحت حاصل ہو جاتی ہے۔

قولِ دوم: سائحین سے مراد طالبِ علم ہیں، جو ایک شہر سے دوسرے شہر کو طلبِ علم کی خاطر منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ اور یہ (ابنِ عباسؓ کے شاگرد اور مشہور تابعی) عکرمہؒ کا قول ہے۔ (اس موقع پر امام رازی نے سیاحت کے بارے میں بنی اسرائیل کی اُس بدکار عورت کے لڑکے کا واقعہ بھی نقل کیا ہے جو اُوپر ابنِ جریر کے حوالے سے گزر چکا ہے۔ پھر اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں) میں کہتا ہُوں کہ تکمیلِ نفس کے لئے سیاحت کی عظیم تاثیر ہوتی ہے۔ کیونکہ اس راہ میں طالب طرح طرح کے مصائب سے دوچار ہوتا ہے، جن پر اُس کے لئے صبر و ثابت قدمی ضروری ہوتی ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب توشہ ختم ہو جائے تو وہ توسل علی اللہ کا محتاج ہو جاتا ہے۔ (پھر) اُس کی ملاقات مختلف فضلاء سے ہوتی ہے، جن میں سے ہر ایک سے وہ مخصوص فائدہ اٹھاتا ہے۔ اور اُس کی ملاقات جب اکابر سے ہوتی ہے تو اُن کے مقابلے میں وہ خود کو حقیر سمجھنے لگتا ہے۔ اور کبھی وہ اپنے کثیر مقاصد کو پالیتا ہے اور اُن سے فائدہ اُٹھاتا ہے۔ اور وہ کبھی دُنیا والوں کے مختلف احوال کا مشاہدہ کرتا ہے جو مخصوص (جغرافیائی) اختلافات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ان احوال و کوائف کے ذریعے اُس کی معرفت قوی ہو جاتی ہے۔ بہر حال دینی اعتبار سے "سیاحت" کے ذریعہ قوی اثرات حاصل ہوتے ہیں۔

قولِ سوم: ابومسلم نے کہا ہے کہ "سائحون" سے مراد زمین میں چلنے پھرنے والے لوگ ہیں۔

(السائرون فی الارض) ۔ اور یہ لفظ "سَیح" سے ہے، جو بہتے ہُوئے پانی کو کہتے ہیں۔ اور اس سے مراد وہ شخص ہے جو جہاد اور ہجرت کی غرض سے نکلے۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس سے پہلی آیت (توبہ: ۱۱۱) میں اللہ تعالیٰ نے مومنین کو جہاد پر اُبھارا ہے۔ پھر یہ آیت (توبہ: ۱۱۲) مجاہدین کی صفات کے طور پر مذکور ہے۔ لہٰذا مناسب یہ ہے کہ مجاہدین ان تمام صفات سے متصف ہوں۔ [۳۶]

اور امام راغبؒ لکھتے ہیں:

"(السائحون) یعنی روزہ رکھنے والے (السائحات) روزہ رکھنے والیاں۔ بعض نے کہا ہے کہ روزہ کی دو قسمیں ہیں: ایک تو حقیقی روزہ یعنی ترکِ طعام و جماع۔ اور دوسرے حکمی روزہ یعنی جوارح کو گناہوں سے محفوظ رکھنا، جیسے آنکھ، کان اور زبان۔ اس لحاظ سے (حقیقی) "سائح" وہ ہے جو دوسری قسم کا روزہ رکھے۔ نیز یہ بھی کہا گیا ہے کہ "سائحون" سے مراد وہ لوگ ہیں جو اس آیت کے مقتضا کا قصد کرنے والے ہوں۔ (یتحرّون ما اقتضاہ قولہ ......) : افلم یسیروا فی الارض فتکون لھم قلوب یعقلون بھا او اٰذان یسمعون بھا" (کیا اُنھوں نے زمین میں چل پھر کر نہیں دیکھا کہ ان کے لئے سمجھنے والے دل اور سننے والے کان ہوتے ہیں!) [۳۷]

مختلف اقوال میں تطبیق

مذکورہ بالا اقوال و مباحث سے حسبِ ذیل تفسیریں سامنے آتی ہیں:

۱۔ تقریباً تمام ائمہ لغت اور مفسرین کے نزدیک اس سے اولین طور پر روزہ رکھنے والے مراد ہیں اور ثانوی طور پر کچھ اور۔

۲۔ دوسرے نمبر پر جہاد مراد ہے۔

۳۔ تیسرے نمبر پر طلبِ علم مراد ہے۔

۴۔ چوتھے نمبر پر مہاجرین یعنی ہجرت کرنے والے لوگ مراد ہیں۔

---

[۳۶] مفاتیح الغیب المعروف بہ تفسیرِ کبیر، ۱۶/۲۰۳۔۲۰۴، طبع جدید۔

[۳۷] المفردات فی غریب القرآن، ص ۲۴۶، دار المعرفۃ بیروت۔

۵ ۔ اور پانچویں نمبر پر امام راغب کی تصریح کے مطابق عالمِ تکوین سے متعلق اللہ کی آیات اور اس کی نشانیوں کا سراغ لگانے کی خاطر مختلف مقامات کا سفر کرنے والے بھی مراد ہو سکتے ہیں ۔

۶ ۔ اور چھٹے نمبر پر اس میں سفرِ حج بھی شامل ہو سکتا ہے ۔ جیسا کہ ابنِ عمرؓ کی ایک حدیث سے اس کا اشارہ نکلتا ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ عادۃِ مبارکہ تھی کہ جب کبھی آپ کسی غزوے یا سفرِ حج یا سفرِ عمرہ سے لوٹتے تو راہ میں کسی بلندی سے گزرتے ہوئے آپ پہلے تو تین بار تکبیر کہا کرتے ، پھر یوں فرماتے:

لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ، لہ الملک ولہ الحمد ، وھو علی کل شیٔ قدیر ، آئبون ، تائبون ، عابدون ، سائحون لربنا ، حامدون ، صدق اللہ وعدہ ، ونصر عبدہ ، وھزم الأحزاب وحدہ : اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ۔ وہ وحدہٗ لاشریک ہے ۔ سارا ملک اُسی کا اور سب تعریف اُسی کے لئے ہے ۔ اور وہ ہر چیز کی قُدرت رکھنے والا ہے ۔ (ہم سب) لوٹنے والے ، توبہ کرنے والے ، عبادت کرنے والے ، اپنے رب کے لئے سیاحت کرنے والے اور حمد کرنے والے ہیں ۔ اللہ نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اپنے بندے کو کامران بنایا ۔ اور (باطل) فوجوں کو تنہا شکست دی ۔ [۳۸]

اس دعائے نبوی میں قرآن کی زیرِ بحث آیتِ کریمہ کے اکثر الفاظ موجود ہیں اور لفظ سائحون بھی مذکور ہے ۔ اس سے یہ استنباط ہو سکتا ہے کہ اس قسم کے اسفار بھی اس لفظ کے مقتضا کے مطابق ہو سکتے ہیں ۔ اس طرح رسولِ اکرم صلعم نے بطور نمونہ و مثال اپنے اقوال و افعال کے ذریعہ مختلف اُمور و مسائل کی طرف اشارہ کر دیا ہے ۔

نیز اس موقع پر ایک بہت بڑی حقیقت یہ بھی ملحوظ رہے کہ اس حدیثِ پاک میں سائحون کے ساتھ " لربنا " کی قید بھی لگی ہوئی ہے ، جس کا صاف مفہوم و مقتضا یہ ہے کہ مذکورۂ بالا اقسام میں سے چاہے جس قسم کی بھی " سیاحت " اختیار کی جائے وہ محض اپنے رب کی خاطر اور پروردگارِ عالم کی رضاجوئی کے واسطے ہونی چاہئے ۔ مطلق سیر سپاٹا اور لہو و لعب مطلوب و مقصود نہ رہے بلکہ دل ہمیشہ یادِ الٰہی میں لگا رہے اور خُدا کی یاد ایک لمحے کے لئے بھی دل سے محو نہ ہو ۔ جیسا کہ خود رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مُبارکہ کے

---

[۳۸] جامع ترمذی ، ابواب الحج ، باب ما یقول عند القفول من الحج والعمرۃ ، ۲/۲۱۳ بیروت ۔

مطابق — جیسا کہ مذکورہ بالا احادیث سے آشکارا ہو رہا ہے — سفر و حضر اور سیاحت و صحرا نوردی میں اس قسم کی دُعاؤں سے مقصود یہ ہے کہ خدا کی یاد سے انسان کبھی غافل نہ ہو اور کھیل کود میں پھنس کر خُدائی ضوابط کو کبھی فراموش نہ کرے۔

دیکھئے محض ایک ذراسی قید میں کتنی بڑی حکمت ملحوظ رکھی گئی ہے اور کس کس انداز میں حکمت و بصیرت کے موتی لُٹائے گئے ہیں! کوئی ٹھکانہ ہے اس "کتابِ حکمت" کے شارحِ اعظم (صلی اللہ علیہ وسلّم) کی اس نکتہ سنجی اور دقیقہ آفرینی کا!! کیوں نہ ہو جس طرح قرآنِ حکیم ایک عظیم ترین اور لاثانی کلام ہے اسی طرح اس کا اولین شارح اور ہادیٔ برحق — فداہ اُبی و اُمی — بھی دنیا کا سب سے بڑا نکتہ رس اور تفہیماتِ الٰہیہ کا راز داں تھا جو اشاروں ہی اشاروں میں کتابِ ربانی کے عقدہائے لاینحل کو کھول کے رکھ دیتا اور حکمت و دانش کی ضیا باریوں سے شبِ ظلمت کو روشن کر دیتا ہے، تاکہ اُمتِ مُسلمہ بادِ مخالف اور بادِ سموم کی ہلاکت خیزیوں سے مامون و محفوظ رہے اور باطل کا سر پوری قوت کے ساتھ کُچلا جا سکے۔

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ : وہی ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں ایک رسول انہی میں سے بھیجا جو انہیں اللہ کی آیتیں پڑھ کر سُناتا ہے، اُن کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے (جمعہ: ۲)

"حکمت و دانش" کا یہی وہ انوکھا رُوپ اور اس کی بے مثال ضیا باری ہے، جو ہر دور میں اُمت کے کام آرہی ہے اور آتی رہے گی اور کبھی اور کسی بھی دَور میں اُس کے پائے ثبات میں کسی قسم کی لغزش پیدا نہ ہوگی، خواہ باطل اُس کی راہ مارنے کی کتنی ہی کوشش کیوں نہ کر ڈالے!

اب خُدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کتابِ حکمت اور اُس کے اس بے مثال شارح کے کلام میں اس قسم کے کتنے جواہر پارے "سر بمہر خزانوں" کی طرح موجود و محفوظ ہیں! کون ہے جو ان حکیمانہ کلاموں کی گہرائیوں کو ناپ سکتا ہو؟

وَاِنَّكَ لَتُلَقَّی الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِیْمٍ عَلِیْمٍ : اور تم قرآن کو ایک (انتہائی) حکمت

والی اور علم والی ہستی سے حاصل کر رہے ہو۔ (نمل: ۶)

لہٰذا خود آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ دعویٰ کتنا حقیقت افروز اور عین مطابق واقعہ ہے!

بُعثتُ بجوامع الکلم : میں جامع کلمات کے ساتھ بھیجا گیا ہوں۔[۳۹]

اُلا انی اُوتیت الکتاب ومثلہ معہ، اُلا انی اُوتیت القرآن ومثلہ معہ : ہاں جان لو کہ مجھے کتاب دی گئی ہے اور اُس کے ساتھ اُسی جیسی ایک چیز اور بھی۔ ہاں دیکھو مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اُس کے ساتھ ایک ویسی ہی چیز اور بھی۔[۴۰]

اُس لحاظ سے قرآن اور حدیث دونوں ایک دوسرے کے مُصدق و مؤید ہیں۔ ایک کی حیثیت متن کی سی ہے اور دوسرے کی شرح کی سی، جیسا کہ پچھلے تمام مباحث سے بخوبی واضح ہو گیا۔ اور ان دونوں میں تعارض و تضاد صرف اُس کو نظر آسکتا ہے جس کی آنکھ میں بھینگاپن موجود ہو۔

غرض اہلِ کتاب میں جس قسم کی سیاحت یا رہبانیت مروج تھی اس کو مٹانے کی خاطر اس قسم کے پیمبرانہ ارشادات و ہدایات بطور تحدید نہیں بلکہ بطورِ مثال ہی ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا ان میں کسی قسم کا تعارض و تضاد نہیں ہے۔

نیز عیسائیت میں مروج سیاحت یا رہبانیت چونکہ زُہد و تقشف کے ساتھ ساتھ پُر مشقت طرزِ عبادت تھا، اس لئے اسلام نے اس کا جو بھی نعم البدل تجویز کیا اُس میں بھی مشروعیت کے ساتھ ساتھ مشقت بھی پائی جاتی ہے، خواہ اس کا درجہ کتنا ہی کم کیوں نہ ہو۔ جیسے جہاد، یا روزہ، یا طلبِ علم کے لئے سفر، یا ہجرت، یا سفرِ حج وغیرہ۔ گویا "سیاحت" مشقت کا لازمہ ہے۔ اور یہ عیسائیت و اسلام کے درمیان قدر مشترک ہے، اگرچہ ان دونوں کے اغراض و مقاصد بالکل مختلف و متضاد ہیں، جیسا کہ تفصیل آگے آرہی ہے۔

نیز اسی طرح چونکہ سیاحت کی اصل " سیح " ہے، یعنی بہتا ہُوا پانی، لہٰذا اس لفظ کی اصل کے

---

[۳۹] بخاری، کتاب الاعتصام بکتاب والسنۃ، باب قول النبی صلعم بعثتُ بجوامع الکلم، ۸/۱۳۸، مسلم کتاب المساجد، حدیث نمبر ۶، ۱/۳۷۱، مطبوعہ ریاض۔

[۴۰] مسند احمد بن حنبل : ۴/۱۳۱، مطبوعہ بیروت۔

مطابق مذکورۂ بالا تمام اُمور میں تسلسل و دوامیت بھی ہونی چاہئے۔ جس طرح کہ پانی کی خصوصیت مسلسل بہنا اور جاری رہنا ہے، یعنی جس طرح اس میں ٹھہراؤ نہیں ہوتا اسی طرح اس قسم کی تمام عبادات و ریاضتوں میں بھی دائمی جریان اور بہاؤ ہونا چاہئے۔ یہ نہیں کہ چند دن تو عمل کرتے رہے، پھر تھک کر یا بیزار ہو کر خاموش بیٹھ گئے۔

اسلام کا تکمیلی کارنامہ

اس پوری بحث سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ "سیاحت" سے متعلق جو غلط تصورات اہلِ کتاب اور خصوصاً عیسائیوں میں رائج تھے کہ انتہائی جسمانی اذیت اور ترکِ راحت و لذت قُربِ الٰہی کا ذریعہ ہے یا ہو سکتا ہے، اس باطل اور غیر فطری تصوّرِ حیات کو مٹانا اور نظامِ تمدّن کی صحیح اصلاح کر کے اس کو اپنی اصلی و فطری شکل میں لانا، اسلام کا اصل مقصد تھا۔ ایک طرف تو انتہا پسندی تھی اور دوسری طرف دین و شریعت کے میدان میں نووارد اور بھولے بھالے عرب تھے جو اپنی نو آموزی کی بنا پر اہلِ کتاب کی نام نہاد دینداری سے ایک طرح سے مرعوب یا متاثر تھے اور چاہتے تھے کہ دینداری کے میدان میں ہم بھی اہلِ کتاب کا مقابلہ کریں۔ جیسا کہ مختلف واقعات سے ظاہر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اصلاحی نقطۂ نظر سے شریعت و اخلاق کا یہ ایک نہایت درجہ نازک مرحلہ تھا اور قوموں کی زندگیوں میں ایسے بہت سے نازک مراحل و مقامات آتے رہتے ہیں، جب کہ اُن کا سابقہ مختلف اقوام اور اُن کے نظامہائے اخلاق و تمدّن سے پڑتا ہے۔

غرض ایک طرف تو دین کی تکمیل ہو رہی تھی اور شریعتِ الٰہیہ کی تجدیدِ نو و تشکیلِ نو عمل میں آرہی تھی، دوسری طرف اہلِ کتاب کے غلط معتقدات و مزعومات تھے جن کی اصلاح بھی ضروری تھی، تیسری طرف تازہ دم عربوں کی ــــ جو خلافتِ ارض کا بارِ امانت سنبھالنے کے لئے اہلِ کتاب جیسے عضوِ ناکارہ اور مادۂ فاسد کے مقابلے میں اپنی صالح فطرت کے باعث ہر نقشِ نو کو قبول کرنے کی حیرت انگیز صلاحیت رکھتے تھے ــــ اصلاح و تربیت اس طرح کی جارہی تھی کہ ایک طرف تو وہ اہلِ کتاب کے گمراہانہ اثرات سے محفوظ اور اُن کی پرچھائیوں تک سے دُور بھی رہیں اور دوسری طرف اُن ربانی اہداف و مقاصد

کی تکمیل کا بھی ذریعہ بن سکیں جن کی وجہ سے انسان کی تخلیق عمل میں آئی تھی اور حضرت آدم علیہ السلام کے سر پر تاجِ خلافت رکھا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ سیاحت یا رہبانیت تصورِ خلافت کی عین ضد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو خلافتِ ارضی یا زمین کی جانشینی کا واضح تصور اور واضح مقصدِ حیات دے کر دُنیا میں بھیجا تھا تاکہ دنیا سے ظُلم و زیادتی کو مٹا کر عدلِ الٰہی کو قائم کیا جا سکے۔ چونکہ اس مقصدِ عظیم کی تکمیل اسلام کا بنیادی ہدف تھا، اس لئے دُنیا کے سب سے بڑے معلّمِ اخلاق اور ہادیٔ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے تصورِ سیاحت و رہبانیت پر کاری ضرب لگاتے ہوئے اس کا دھارا دوسری طرف موڑ دیا۔

انسانی فطرت میں یہ بات داخل ہے کہ کوئی شخص کسی ایسے کام کو کرنا چاہتا ہے جس سے وہ کافی متاثر ہے تو وہ منع کئے جانے پر ایک طرح سے افسردہ اور بد دل ہو جاتا ہے اور بعض اوقات اس کے کرنے سے باز نہیں آتا۔ یہ ایک نفسیاتی مسئلہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اخلاقی مسئلہ بھی ہے۔ چونکہ ہادیٔ اعظمؐ انسانی فطرت کے رمز شناس اور سب سے بڑے معلّمِ اخلاق تھے، لہٰذا آپ نے دیکھا کہ اس چیز کی قطعی ممانعت تربیتی نقطۂ نظر سے نقصان دہ ہو سکتی ہے۔ لہٰذا آپ نے اس کا رُخ دوسری طرف پھیرتے ہُوئے نعم البدل کے طور پر چند دوسرے نسخے تجویز فرمائے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے "سیاحت" کو تو باقی رکھا مگر اس کے معنی اور تصورات بدل دئے۔ چنانچہ کبھی تو فرمایا گیا: "سیاحة هذه الامة الجهاد فی سبیل الله تعالیٰ"۔[41] نیز "رهبانية هذه الامة الجهاد فی سبیل الله عز وجل"۔[42] اور کبھی کہا گیا۔ "سیاحة هذه الامة الصیام"۔[43]

یہ نسخہ غالباً نو آموز قسم کے لوگوں کے لئے رہا ہوگا، جیسا کہ اُوپر والی جہاد کی حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بات آپ نے ایک غیر معروف شخص شاید کسی بدوی کے جواب میں ارشاد فرمائی۔ جیسا کہ مروی ہے: "أن رجلاً قال یا رسول الله ائذن لی فی السیاحة"۔ (ایک شخص نے

---

[41] اس اُمت کی سیاحت جہاد فی سبیل اللہ ہے۔

[42] اس اُمت کی رہبانیت جہاد ہے اللہ کے راستے میں۔

[43] اس اُمت کی سیاحت روزے رکھنا ہے۔ (ان حدیثوں کے حوالے پچھلے صفحات میں گزر چکے ہیں)۔

کہا کہ یا رسول اللہ مجھے سیاحت کی اجازت دیجئے)۔ اس کے برعکس وہ حدیثیں جن میں صاف سیاحت کی نفی کی گئی ہے، مثلاً "لا سیاحة فی الاسلام"[۴۴] یا "ان الرهبانية لم تكتب علينا"[۴۵] یہ غالباً راسخ العقیدہ لوگوں سے خطاب یا عمومی اصول کے طور پر ہو سکتا ہے۔ کیونکہ مطالعۂ حدیث کی رُو سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ہر شخص سے اُس کے حالات کے مطابق خطاب فرمایا کرتے تھے۔

صحیح احادیث میں سیاحت کے نعم البدل کے طور پر مذکورۂ بالا دو ہی شکلیں بتائی گئی ہیں، یعنی جہاد اور روزہ۔ بقیہ جو شکلیں ہیں یعنی تعلیمی سفر، ہجرت، حج، آیاتِ الٰہی کا مطالعہ وغیرہ تو یہ سب قیاسی و اجتہادی اُمور ہیں یا اُن کی حیثیت تفسیری اقوال کی سی ہے۔ اس حیثیت سے سب سے زیادہ قوی اور محکم چیزیں یہی دو ہیں، اور ان دونوں میں جہاد کی حیثیت خلافتِ ارض کے نقطۂ نظر سے بہت اہم بلکہ اہم ترین ہے۔ کیونکہ وہ اسلام جو خلافتِ ارض کا محرک اور اُس کی بقا کا ذمہ دار ہے، خود اُس کا اپنا مدار ہی جہاد پر ہے، یعنی جہاد ہی اسلام اور نظامِ اسلام کی بقا کا ضامن ہے اور عالمِ اسلام پر جو بھی مصائب آئے ہیں یا آرہے ہیں یا آئیں گے وہ سب درحقیقت جہاد اور اس کی اسپرٹ کو فراموش کر دینے کا نتیجہ ہیں اور یہ چیز رہبانیت و خانقاہیت کی بھی ضد ہے۔ اسی وجہ سے حدیثوں میں جہاد پر اُبھارا گیا ہے۔ تاکہ نظامِ عالم درہم برہم نہ ہو اور نیک لوگوں کی رہبانیت و خانقاہیت کے باعث شر پسند قوتیں غالب آکر اللہ کی زمین میں فتنہ و فساد نہ پھیلائیں اور اللہ کے فرمانبردار لوگ عزلت و گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر کے شر پسندوں کو کھلی چھوٹ نہ دے دیں بلکہ وہ میدانِ کارزار میں داخل ہو کر ان باطل قوتوں کا مقابلہ کر کے اللہ کی زمین کو فسادیوں سے پاک و صاف کریں۔ ورنہ اللہ کے نام لیواؤں کی زندگی دوبھر ہو جائے گی۔ یہ ہے جہاد کا صحیح مقصد اور اُس کی اسپرٹ۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز سیاحت و رہبانیت کی عین ضد ہے۔

---

۴۴ لسان العرب: ۲/۴۹۳ (اسلام میں سیاحت نہیں ہے)
۴۵ رہبانیت ہم پر مشروع نہیں کی گئی۔ (حوالہ پچھلے صفحات میں)

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَھُمْ بِبَعْضٍ لَّھُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِیَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ یُذْکَرُ فِیْھَا اسْمُ اللّٰہِ کَثِیْرًا ؕ اور اگر اللہ (مختلف لوگوں میں) ایک دوسرے کی مدافعت نہ کرتا تو خانقاہیں' مدرسے' عبادت خانے اور مسجدیں۔ جن میں اللہ کا نام بکثرت لیا جاتا ہے' سب ڈھا دئے گئے ہوتے۔ (حج : ۴۰)

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَھُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ : اور اگر اللہ (اپنی سُنّتِ جاریہ کے مطابق) انسانی (گروہوں میں سے) ایک دوسرے کی مدافعت نہ کرتا تو زمین فساد سے بھر جاتی۔ (بقرہ : ۲۵۱)

یہ تو ہوئی سیاحت و جہاد کی حقیقت و ماہیت اور اُن کا فلسفہ۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ ایک ایسی چیز کو جو درحقیقت سیاحت کی ضد ہے سیاحت بنا کر پیش کی گئی ہے۔ مگر نہیں بلکہ حقیقتاً اسلام نے اس لفظ (سیاحت) کے معنی اپنی مرضی سے بدل دئے ہیں' تاکہ ایک عہد کا خاتمہ ہو کر دوسرا نیا عہد اس کے ذریعہ شروع ہو۔ یہ اسلام کا ایک عظیم ترین کارنامہ ہے جو درحقیقت تکمیلِ دین سے تعلق رکھتا ہے۔

اب رہا معاملہ روزے کا۔ تو یہ اُن تمام لوگوں کے لئے قابلِ عمل ہے جو کسی سبب یا مجبوری کی وجہ سے جہاد میں حصہ نہ لے سکتے ہوں۔ اگر آپ غور فرمائیں تو نظر آئے گا کہ روزہ بھی درحقیقت ایک قسم کا جہاد ہی ہے۔ کیونکہ اس میں بھی مشقت اور نفس کا مجاہدہ ہوتا ہے۔ بلکہ یہ بھی دراصل جہاد کی تیاری ہی کا ایک اہم ذریعہ و وسیلہ ہے۔ اور اس کے ذریعے عوام کی تربیت ہوتی ہے اور اُن مشقتوں اور صعوبتوں کو برداشت کرانے کی گویا ایک مشق کرائی جاتی ہے' جو راہِ جہاد میں پیش آسکتے ہیں۔ اس اعتبار سے سیاحت سے روزہ مراد ہونا ایک عمومی کُلیہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اس معنی میں سب سے زیادہ مشہور ہو گیا۔

بہرحال ہر شخص اپنے حالات اور اپنے ظرف و حوصلے کے مطابق ان مختلف تاویلات میں سے کسی پر بھی عمل کر کے "سائح" بن سکتا اور "سائح" کہلا سکتا ہے اور یہ دروازہ ہر خاص و عام کے لئے کُھلا ہُوا ہے۔ وللہ الحمد حمداً طیباً کثیراً۔

سیاحت اور سیر و تفریح

اس تفصیلی بحث اور حقیقتِ حال کی وضاحت کے بعد اب مزید کسی تردید یا لمبی چوڑی بحث کی ضرورت تو باقی نہیں رہی، ہاں البتہ چند نکات کی وضاحت ناگزیر نظر آتی ہے، تاکہ یہ بحث ہر حیثیت سے مکمل ہو جائے۔

چنانچہ یہ حقیقت بخوبی ظاہر ہو گئی کہ سیر و سیاحت کا جدید مفہوم اس قرآنی مفہوم و مقتضیٰ سے میل نہیں کھاتا۔ بالفاظِ دیگر آزادانہ سیر و سیاحت یا سیر و سپاٹے کی اس لفظ کے تحت کوئی گنجائش نہیں نکل سکتی۔ اور یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ زیرِ بحث آیتِ کریمہ (توبہ: ۱۱۲) میں مذکور تمام صفات (التائبون العابدون الحامدون السائحون الراکعون الخ) آزادانہ سیر و سیاحت کے مفہوم سے ہم آہنگ نظر نہیں آتیں اور اس قسم کا کوئی بھی مفہوم ائمہ لغت و تفسیر کے خلاف بلکہ کلامِ عرب کے بھی خلاف ہے اور اس کی تائید میں کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ درجے کی تائید بھی پیش نہیں کی جا سکتی۔ مفسرین و مترجمین کو کوسنا تو خود اپنی جہالت کا ثبوت دینا یا اندھیرے میں تیر چلانا ہے۔

اور یہ تمام صفات، جیسا کہ تفسیرِ کبیر کا حوالہ اوپر گزر چکا (سیاقِ کلام کے اعتبار سے) مجاہدین کی صفات کے طور پر وارد ہوئی ہیں، جن کا تذکرہ ماقبل کی آیت میں " ان اللہ اشتریٰ من المؤمنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنة یقاتلون فی سبیل اللہ الخ (ترجمہ شروع میں گزر چکا ہے) کی شکل میں کیا گیا ہے۔ نحوی اور ادبی اعتبار سے تفسیرِ کبیر اور دیگر تفاسیر کے مطابق اس کی توجیہہ اس طرح کی گئی ہے: ھم التائبون العابدون الخ۔ یعنی اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے وہی لوگ ہیں جو توبہ کرنے والے، عبادت گزار، حمد کرنے والے، "سیاحت" کرنے والے، رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، معروف کا حکم کرنے والے، منکر سے روکنے والے اور اللہ کی حدود کو قائم کرنے والے ہیں"!

سیاحت عربی اور اُردو میں

ظاہر ہے کہ عقلی اعتبار سے بھی اس سیاق و سباق میں مطلق سیر و سپاٹے کا کوئی جوڑ نہیں بیٹھتا۔ اصل میں دھوکا لفظِ سیاحت سے ہو جاتا ہے، جس کا معنی و مفہوم عربی میں کچھ ہے تو اُردو میں کچھ اور۔ اُردو میں مروجہ مفہوم کے اعتبار سے لفظِ سیاحت کے تصور ہی سے ذہن میں سیر و تفریح اور دورِ جدید کے

مہیا کردہ تمام لوازم کا تصوّر بھی آجاتا ہے۔ ذرا آپ موجودہ دور کے اُونچے درجے کے فائیو اسٹار FIVE STAR ہوٹلوں اور ان کی فراہم کردہ تفریحات یعنی " فائیو اسٹار کلچر " کا تصوّر کیجیۓ جو آجکل کی معیاری سیاحت و تفریح کا ایک لازمہ ہے۔ اور آپ ملاحظہ کر چکے ہیں کہ کلامِ عرب اور ائمہ لغات کی تصریحات کی روشنی میں اس قسم کے " مُسرفانہ مفہوم " کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ چونکہ لفظ " سیاحت " عربی اور اُردو میں مشترک ہے، اس لئے اکثر دھوکا ہو جاتا ہے کہ ہمارے ذہنوں میں جو مفہوم ہے لازماً وہی مفہوم قرآن کا بھی ہوگا اور ہونا چاہیئے۔ حالانکہ ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شوقیہ اور محض دل بہلانے کی خاطر سفر کرتا ہو اور جواز کے طور پر اس آیت کو پیش کرتا ہو تو یہ ایک غلط استدلال ہوگا۔

اس موقع پر یہ غلط فہمی نہ رہے کہ راقم سطور کو مطلق سفر و سیاحت یا تفریح پر اعتراض ہے یا اس کو وہ ناجائز سمجھتا ہے۔ مگر بات آیتِ قرآنی سے استدلال کی ہے۔ خُدا نے اگر آپ کو فراخی عطا کی ہے تو تفریح کیجیۓ اور ضرور کیجیۓ، مگر خُدارا اس آیت کو دلیل نہ بنائیے۔

واقعہ یہ ہے کہ عربی اور اُردو میں بہت سے ایسے مشترک الفاظ پائے جاتے ہیں جن کا مفہوم عربی میں کچھ اور ہے اور اُردو میں کچھ اور۔ جیسے لفظ "صداقت" عربی میں دوستی کو کہتے ہیں، مگر اُردو میں یہ سچائی کے معنی میں مستعمل ہے۔ اسی طرح عربی میں " غُرور " کے معنی فریب کے ہیں مگر اُردو میں یہ تکبّر کا ہم معنی ہے۔ عربی میں اور خاص کر قرآنی محاورے میں " ظُلم " بے جا حرکت کو کہتے ہیں۔ (وضع الشئ فی غیر محلّہٖ)۔ مگر اُردو میں اس کے معنی کسی کو ستانے کے ہیں۔ " دولت " عربی میں حکومت کے ہم معنی ہے مگر اُردو میں مال متاع کے لئے بولا جاتا ہے۔ " شربت " عربی میں ایک گھونٹ کو کہتے ہیں، لیکن اُردو میں ایک میٹھے اور خوش گوار مشروب کا نام ہے۔ اسی طرح "شراب" عربی میں کسی بھی پی جانے والی چیز یا مشروب کو کہہ سکتے ہیں۔ (قرآن میں پانی اور شہد وغیرہ کو شراب کہا گیا ہے) مگر اُردو میں شراب صرف نشہ لانے والی حرام چیز کا نام ہے۔ اگر غلطی سے کوئی عربی داں جو اُردو نہ جانتا ہو کسی اُردو داں سے " شراب " کا مطالبہ کر بیٹھے تو پھر قیامت ہی آجائے گی۔

غرض اس طرح کے سیکڑوں الفاظ ہیں، جن کے معانی و مطالب میں دونوں زبانوں میں نمایاں

فرق ہے۔ یہی حال لفظ سیاحت کا بھی ہے۔ بے شک یہ لفظ جدید عربی میں ٹھیک اُسی معنی میں مستعمل ہے جو اُردو میں مستعمل ہے۔ یعنی:

TRAVEL ; JOURNEY ; TOUR [۴۶]

مگر یہاں پر بحث قدیم عربی اور قرآن و حدیث کے محاورات کی ہے، چاہے اس کے معنی جدید عربی میں کچھ ہی کیوں نہ بن گئے ہوں۔

عربی کے جدید مفسرین

اس ملاحظے کے بعد عرض ہے کہ عربی کے جن جدید مفسرین نے اس آیتِ کریمہ کی تفسیر میں بعض نئے خیالات اور نئی تعبیرات کا اظہار کیا ہے انہوں نے بھی اس کو مشروط طور پر دینی مقاصد ہی کے تحت رکھا ہے اور مطلق سیر و سیاحت کا کوئی بھی قائل نہیں ہے۔ مثلاً علامہ سید رشید رضا مصری اور سید قطب شہید وغیرہ۔

چنانچہ اول الذکر اپنی تفسیر میں تحریر کرتے ہیں جس کا ملخص یہ ہے کہ "سائحون" سے مُراد وہ لوگ ہیں جو اقطارِ ارض میں کسی صحیح غرض کی خاطر سفر کرتے ہوں، خواہ وہ علم سے متعلق ہو یا عمل سے، جیسے جہاد فی سبیل اللہ، طلبِ علم، جو اپنی قوم کے لئے دینی و دنیوی دونوں اعتبار سے نافع ہو یا مخلوقاتِ الٰہی اور مختلف قوموں کے حالات و واقعات کا جائزہ لینے کی غرض سے ہو۔ نیز اللہ کی آیات و نشانات کا مشاہدہ کرنے کی غرض سے، جس پر قرآن کی بہت سی آیتوں میں اُبھارا گیا ہے۔

اسی طرح موصوف نے "سائحات" کے تحت عورت کو بھی اپنے شوہر یا کسی ذی محرم کے ساتھ صحیح غرض کے تحت سیاحت کو بھی جائز بتایا ہے کیونکہ اسلام میں عورت کا سفر ذی محرم کے بغیر ممنوع ہے۔

نیز موصوف نے اس میں تجارت اور رزقِ حلال کی تلاش و طلب کو بھی شامل کیا ہے۔[۴۷]

اور سید قطب کا رجحان اس طرف ہے کہ اس سے مُراد اللہ کی مخلوق اور اُس کے سنن و آثار میں غور و فکر کرنے والے ہیں۔[۴۸]

۴۶ھ ملاحظہ ہو: القاموس العصری، مؤلفہ الیاس انطون الیاس، بیروت۔
۴۷ھ ملخص از تفسیر المنار: ۱۱/۵۲، مطبوعہ بیروت۔
۴۸ھ فی ظلال القرآن: ۱۱/۴۹، بیروت، ۱۳۸۶ھ۔

سیاحت اور مترجمینِ اُردو

اس جائزے سے واضح ہوگیا کہ اس قرآنی لفظ سے مقصود مطلق سیر و سیاحت کسی حال میں بھی درست نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ ابنِ کثیر نے اپنی تفسیر میں اُس سیر و سیاحت کی مذمت کی ہے جو کسی صحیح غرض و غایت کے لئے نہ ہو۔[۴۹] لہٰذا جن مترجمین نے اس کا ترجمہ محض "سیر و سیاحت" کیا ہے وہ غلط اور خلافِ احتیاط ہے اور اس وقت میرے سامنے اُردو کے جو مختلف ترجمے ہیں ان میں سوائے مولانا آزاد مرحوم کے کسی نے اس کا ترجمہ سیر و سیاحت نہیں کیا ہے[۵۰] جن کی صاحبِ مضمون تعریف و تحسین کررہے ہیں۔

مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا فتح محمد جالندھری، مولانا احمد علی لاہوری، مولانا سعید احمد دہلوی اور مولانا عبدالماجد دریابادی وغیرہ اس کا ترجمہ "روزہ رکھنے والے" کرتے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اس کا ترجمہ خُدا کی راہ میں سفر کرنے والے (سفر در راہِ خُدا کنندگان) کرتے ہیں۔ ان کے اتباع میں شاہ رفیع الدین صاحب، ڈپٹی نذیر احمد دہلوی، مولانا عبدالحق حقانی اور مرزا حیرت دہلوی نے تھوڑے سے لفظی فرق کے ساتھ یہی ترجمہ کیا ہے۔

مولانا ثناء اللہ امرتسری صرف "سفر کرنے والے" مولانا مودودی "اللہ کی خاطر زمین میں گردش کرنے والے" اور مولانا امین احسن اصلاحی "ریاض کرنے والے" تحریر کرتے ہیں۔

سب سے زیادہ اچھوتا ترجمہ شاہ عبدالقادر دہلوی کا ہے، جنھوں نے "بے تعلق رہنے والے" کیا ہے۔ یعنی دُنیا اور اس کے مرغوبات میں دل نہ لگانے والے۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے اپنے ترجمے میں اسی کا اتباع کیا ہے۔

میری نظر میں ترجیح اُس ترجمے کو ہوگی جس میں روزہ رکھنا مُراد لیا گیا ہو، جیسا کہ دلائل سے بخوبی ظاہر ہوگیا۔ پھر اس کے بعد سب سے بہتر ترجمہ وہ ہوگا جس کو حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کے متبعین نے کیا ہے، یعنی "اللہ کی راہ میں سفر کرنے والے"۔ اس میں وہ تمام خوبیاں داخل ہو جاتی

---

[۴۹] تفسیر القرآن العظیم : ۲/۳۹۲ ، مطبوعہ مصر۔

[۵۰] یہاں پر یہ بات صرف ترجمے کی ہے، اگرچہ موصوف نے اس کی جو تفسیر کی ہے وہ بالکل درست ہے۔

ہیں جو روزہ رکھنے کے ماسوا کُتبِ تفاسیر میں وارد ہُوئی ہیں۔ اور اس میں جہاد بھی شامل ہو سکتا ہے، جس کی میرے نزدیک خلافتِ ارض کے نقطۂ نظر سے سب سے زیادہ اہمیت ہے۔

اس جائزے سے بخوبی واضح ہوگیا کہ آج مسلمان عورت کی نام نہاد حالتِ زار پر آنسو بہانے اور اُس کو گھر سے "بے گھر" کرنے کے لئے قرآن کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے اور ائمہ کرام پر ناحق کیچڑ اُچھالنے والوں کی علمیت کا کیا حال ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بالکل سطحی معلومات کے ذریعہ علم و تحقیق کے نام پر غُل غپاڑہ مچانا اور اوچھے طریقے اختیار کرنا موجودہ دور کی " روشن خیالی" کا خاصہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ عصرِ جدید کے نام نہاد ترقی پسند سیدھے سادے مسلمانوں کو بہکانے اور انہیں فریب میں مبتلا کرنے کے لئے قرآن یا حدیث کا کوئی ایک فقرہ اُچک لیتے ہیں اور اس میں اپنی طرف سے سو جھوٹ ملا کر اور اسے خوشنما بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ تاکہ لوگ قرآن اور حدیث کے نام پر ان کے دامِ فریب میں آجائیں۔ اسی وجہ سے قرآنِ حکیم میں کہا گیا ہے کہ مُسلمان ایسے لوگوں کی طرف سے پیش کردہ آیاتِ الٰہی تک پر بھی اندھے بہرے ہو کر یقین نہ کرلیں بلکہ اچھی طرح تحقیق کرلیں کہ ان لوگوں کی باتوں میں کہیں کھوٹ تو نہیں ہے!

وَالَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوا عَلَيْهَا صُمًّا وَعُمْيَانًا : اور (رحمان کے بندے) وہ لوگ ہیں جب ان کے سامنے ان کے رب کی آیتیں پیش کی جاتی ہیں تو وہ ان پر اندھے بہرے بن کر گر نہیں پڑتے۔ (فرقان : ۷۳)

فہرستِ مراجع

۱ - قرآن مجید
۲ - تفسیر ابنِ جریر ، ابنِ جریر طبری، دار المعرفہ بیروت
۳ - تفسیر درمنثور ، علامہ سیوطی " "
۴ - تفسیر ابنِ کثیر ، علامہ ابنِ کثیر ، عیسی البابی الحلبی مصر
۵ - تفسیر کبیر ، امام رازی ، جدید ایڈیشن ، مطبوعہ ایران
۶ - تفسیر کشاف ، علامہ جار اللہ محمود زمخشری ، مطبوعہ ایران
۷ - تفسیر بیضاوی ، عبداللہ عمر بیضاوی ، مطبوعہ دیوبند
۸ - تفسیر المنار ، مرتب شیخ رشید رضا ، دار المعرفہ بیروت
۹ - فی ظلال القرآن ، سید قطب ، بیروت
۱۰ - ترجمان القرآن ، مولانا ابوالکلام آزاد ، ساہتیہ اکیڈمی نئی دہلی
۱۱ - مختلف تراجم قرآن
۱۲ - صحیح بخاری ، امام محمد بن اسماعیل بخاری ، مطبوعہ استانبول
۱۳ - صحیح مسلم ، امام مسلم نیشاپوری ، مطبوعہ ریاض
۱۴ - سنن ابوداؤد ، امام ابوداؤد سجستانی ، مطبوعہ حمص (شام)
۱۵ - جامع ترمذی ، امام ابوعیسیٰ ترمذی ، مطبوعہ بیروت
۱۶ - سنن نسائی ، امام نسائی ، مطبوعہ دیوبند
۱۷ - مُسند احمد ، امام احمد بن حنبل ، مطبوعہ بیروت
۱۸ - سنن دارمی ، امام ابومحمد عبداللہ دارمی ، دار الکتب العلمیہ بیروت
۱۹ - لسان العرب ، علامہ ابنِ منظور افریقی مصری ، دار صادر بیروت
۲۰ - القاموس المحیط ، مجدالدین فیروز آبادی ، دار الفکر بیروت
۲۱ - المفردات فی غریب القرآن ، امام راغب اصفہانی ، دار المعرفہ بیروت
۲۲ - المعجم الوسیط ، مصری اکیڈمی کی تیار کردہ ، مطبوعہ بیروت
۲۳ - القاموس العصری ، الیاس انطون الیاس ، بیروت
۲۴ - المنجد ، الاب لوئیس معلوف ، بیروت
۲۵ - سیر الصحابیات ، مولانا سعید انصاری ، اعظم گڑھ

مولانا محمّد شہاب الدّین ندوی

اسلامی شریعت کی صداقت ثابت کر رہے ہیں

حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی کا بیان

اسلامی دین و شریعت کی عظمت و برتری موجودہ دور کے تقاضوں کے مطابق علمی وعقلی نقطۂ نظر سے ثابت کرنے کے سلسلے میں فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ بنگلور کے بانی و جنرل سکرٹری مولانا محمد شہاب الدین ندوی آج کل جو اہم ترین علمی و تحقیقی خدمات انجام دے رہے ہیں اُس کا اعتراف کرتے ہوئے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر مفکرِ اسلام حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی نے حسبِ ذیل بیان جاری کیا ہے :

" اہلِ علم و نظر سے مخفی نہیں کہ شریعتِ آسمانی کی صداقت و ابدیت ہر زمانہ اور ہر مقام و ماحول میں اس کی انسانی قیادت کی صلاحیت اور پیدا ہونے والے مسائل و مشکلات کا مقابلہ کرنے، جائز انسانی تقاضوں کی تکمیل اور تمدن و معاشرہ کی رہبری کی قابلیت ثابت کرنا دین کی ایک اہم خدمت اور وقت کا ایک اہم فریضہ ہے۔ اس کے لئے ایسے وسیع المطالعہ صحیح الذہن اور عمیق النظر اہلِ علم و قلم کی ضرورت ہے جو کتاب و سُنّت، فقہ کے ذخیرہ اور علمائے سلف کی محنتوں اور کاوشوں اور تحقیقات و تصنیفات کی واقفیت کے ساتھ ضروری حد تک ادیان و ملل کی تاریخ، تمدن و معاشرہ کی تبدیلیوں اور فکرِ انسانی کی ارتقاء سے بھی واقف ہوں، انہوں نے مغرب کی نشأۃ ثانیہ کی تاریخ اور معرکۂ مذہب و علم کی خوں ریز داستان پڑھی ہو اور مختلف اقوام و مذاہب کے قوانین پر بھی نظر رکھتے ہوں۔ اور ان کا مطالعہ تقابلی اور حقیقت پسندانہ ہو۔ اس دورِ تشکیک و ارتیاب میں جب تعلیم یافتہ مسلمان ذہنی و علمی طور پر اپنی شریعت و ملت اور اپنے تمدن و نظامِ زندگی کے بارے میں احساسِ کمتری اور بہت سے شکست خوردگی کے شکار ہیں، ایسے باخبر و باحمیت، مستعد و جفاکش اہلِ علم و قلم کی ضرورت بہت بڑھ جاتی ہے، جو تعلیم یافتہ طبقے میں شریعتِ اسلامی، ملتِ ابراہیمی اور قرآنی تعلیمات کی صداقت و اعجاز کے بارہ میں اس طبقے میں نیا اعتماد پیدا کریں، اکھڑتے ہوئے قدموں کو جمائیں اور علم و مطالعہ کی راہ سے ایمان کو قوت پہنچائیں۔

عزیز گرامی قدر مولوی شہاب الدین ندوی انہیں معدودے چند افراد میں ہیں، جن کو اللہ نے یہ سعادت و صلاحیت عطا فرمائی ہے اور اس مطالعہ و محنت کی توفیق دی ہے جو ہمارے نوجوان علماء اور مدارس کے فضلاء میں اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ وہ اپنی طالب علمی کے زمانے ہی سے مطالعہ و محنت کے عادی رہے ہیں۔ اور اب انہوں نے فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ بنگلور کو قائم کر کے اپنے مطالعہ و فکر کے نتائج کی تدوین و ترتیب پھر اشاعت و طباعت کے ذریعہ اس میں بڑی وسعت و افادیت پیدا کر دی ہے۔ ان کے مضامین ہندستان و پاکستان کے مؤقر علمی رسائل میں قدر اور ذوق و شوق کے ساتھ شائع کئے جاتے ہیں اور ہر تھوڑے عرصے کے بعد ان کے ادارہ سے کوئی مفید کتاب یا رسالہ نکلتا ہے، جن میں سے ان کی چند تازہ کتابوں کا نام لینا کافی ہے : (۱) اسلامی شریعت علم اور عقل کی میزان میں (۲) اسلام اور جدید سائنس (۳) قرآن مجید اور دُنیائے حیات (۴) تعددِ ازدواج: علم و عقل کی کسوٹی پر وغیرہ

ہمیں صاحبِ حمیت مسلمانوں اور علم کے قدردانوں سے اُمید ہے کہ وہ اس ادارہ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ تعاون فرمائیں گے، تاکہ وہ مزید خدمات انجام دے سکے۔ ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین "

ابوالحسن علی ندوی

۸ر جنوری ۱۹۸۸ء

مفکرِ اسلام مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ
کی شہرۂ آفاق کتاب
انسانی دنیا پر مسلمانوں کے
عروج وزوال کا اثر
جو اس وقت دنیا کی چھ زبانوں (عربی، انگریزی، فرنچ، اردو، فارسی، ترکی)
میں پڑھی جا رہی ہے اور جس کے متعلق مشہور مستشرق پروفیسر سارجنٹ (کیمبرج یونیورسٹی) کو
کہنا پڑا کہ "اگر برطانیہ میں کسی کتاب کی درآمد پر پابندی لگانے کا رواج ہوتا تو میری سفارش ہوتی
کہ اس کتاب کے داخلے پر پابندی عائد کی جائے اس لئے کہ اس کتاب میں صرف مغربی تہذیب کی مذمت کی گئی ہے"
جس کو پڑھ کر مغربی دنیا کے نامور فاضل لندن یونیورسٹی میں مڈل ایسٹ سیکشن کے چیرمین
ڈاکٹر بکنگھم نے ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا کہ "اس صدی میں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کی جو
کوشش بہتر سے بہتر طریقے پر کی گئی ہے یہ اس کا نمونہ اور تاریخی دستاویز ہے۔"
جس کو پڑھ کر عالم اسلام کے نامور مفکر اور مشہور صاحب قلم سید قطب شہیدؒ نے ان الفاظ
میں داد دی کہ "اس موضوع پر تمام قدیم وجدید لٹریچر میں چند بہترین کتابیں جو میری نظر سے گزری
ہیں ان میں یہ کتاب خاص مقام رکھتی ہے، یہ کتاب تاریخ نویسی کا ایک کامیاب نمونہ ہے" اس سے
معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسلمان کو یورپ کے اسلوب نگارش سے بے نیاز ہو کر تاریخی مباحث پر کس طرح
قلم اٹھانا چاہیئے اور کس انداز سے اس کو مرتب کرنا چاہیئے۔"
جس کو مشرق وسطیٰ کی عظیم تحریک اخوان المسلمین نے اپنے تربیتی کورس میں داخل کیا اور
سعودی عرب کی وزارتِ تعلیمات نے اپنے کالجوں کے نصاب میں جگہ دی۔
جو مشرق کے لئے ایک تازیانہ اور مغرب کے لئے ایک چیلنج ہے۔
ناشر: فضل ربی ندوی
مجلس نشریاتِ اسلام
۱-کے-۳ ناظم آباد مینشن ناظم آباد نمبر۱ کراچی "۲۶۰۰"
فون نمبر ۶۲۱۸۱۷

پندرھویں صدی ہجری کے لئے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ العالی کا ایک عظیم تحفہ

ایک حیات آفرین پیغام

تاریخ دعوت وعزیمت

(چھ حصوں میں)

حصہ اوّل : پہلی صدی ہجری سے لے کر ساتویں صدی ہجری تک عالم اسلام کی اصلاحی وتجدیدی کوششوں کا تاریخی جائزہ، نامور مصلحین اور ممتاز اصحاب دعوت وعزیمت کا مفصل تعارف، ان کے علمی کارناموں کی روداد اور ان کے اثرات ونتائج کا تذکرہ۔

حصہ دوم : جس میں آٹھویں صدی ہجری کے مشہور عالم ومصلح شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ کی سوانح حیات، ان کے صفات وکمالات، ان کی علمی وتصنیفی خصوصیات، ان کا تجدیدی واصلاحی کام اور ان کی اہم تصنیفات کا مفصل تعارف اور ان کے ممتاز تلامذہ اور منتسبین کے حالات۔

حصہ سوم : حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاؒ، حضرت مخدوم شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے سوانح حیات۔ صفات وکمالات، تجدیدی واصلاحی کارنامے، تلامذہ اور منتسبین کا تذکرہ وتعارف۔

حصہ چہارم : یعنی مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندیؒ (۹۷۱-۱۰۳۴ھ) کی مفصل سوانح حیات، ان کا عہد اور ماحول، ان کے عظیم تجدیدی وانقلابی کارنامے کی اصل نوعیت کا بیان، ان کا اور ان کے سلسلے کے مشائخ کا اپنی اور بعد کی صدیوں پر گہرا اثر اور ان کی اصلاحی وتربیتی خدمات۔

حصہ پنجم : تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، احیائے دین، اشاعت کتاب وسنت، اسرار ومقاصد شریعت کی توضیح وتنقیح۔ تربیت وارشاد اور ہندوستان میں ملت اسلامی کے تحفظ اور تشخص کے بقا کی ان عہد آفریں کوششوں کی روداد، جن کا آغاز حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کے اخلاف وخلفا کے ذریعے ہوا۔

حصہ ششم : حضرت سید احمد شہیدؒ کے مفصل سوانح حیات، آپ کے اصلاحی وتجدیدی کارنامے اور غیر منقسم ہندوستان کی سب سے بڑی تحریک جہاد وتنظیم اصلاح وتجدید اور احیائے خلافت کی تاریخ۔ (دو جلدوں میں مکمل)

ناشر: فضلِ ربی ندوی

مجلسِ نشریاتِ اسلام ۱۔کے۔۳ ناظم آباد مینشن، ناظم آباد ۱ کراچی ۱۸

مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

کی چند اہم شاہکار تصنیفات

- تاریخ دعوت و عزیمت مکمل (پانچ حصے)
- مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش
- انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر
- منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین
- دریائے کابل سے دریائے یرموک تک
- تذکرہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی
- تہذیب و تمدن پر اسلام کے اثرات و احسانات
- تبلیغ و دعوت کا معجزانہ اسلوب
- مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں
- نئی دنیا (امریکہ) میں صاف صاف باتیں
- جب ایمان کی بہار آئی
- مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت
- حجاز مقدس اور جزیرۃ العرب
- عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح
- تزکیہ و احسان یا تصوف و سلوک
- مطالعۂ قرآن کے بنیادی اصول
- سوانح شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا
- خواتین اور دین کی خدمت
- کاروان ایمان و عزیمت
- سوانح مولانا عبدالقادر رائے پوری

- نبی رحمت مکمل
- حدیث کا بنیادی کردار
- معرکۂ ایمان و مادیت
- پرانے چراغ مکمل (دو حصے)
- ارکان اربعہ
- نقوش اقبال
- کاروان مدینہ
- قادیانیت
- تعمیر انسانیت
- حدیث پاکستان
- اصلاحیات
- صحبتے با اہل دل
- کاروان زندگی مکمل
- مذہب و تمدن
- دستور حیات
- حیات عبدالحی
- دو متضاد تصویریں
- تحفۂ پاکستان
- پاجا سراغ زندگی
- عالم عربی کا المیہ

ناشر: فضل ربی ندوی — فون ۹۲۱۸۱۷ - ۹۳۰۸۹۹

مجلس نشریات اسلام (۱-کے-۳ ناظم آباد مینشن، ناظم آباد) کراچی ۱۸